ہندوستان کی کہانی
ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان کی کہانی
ڈاکٹر مبارک علی
NATIONAL BOOK FOUNDATION
نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

ہندوستان کی کہانی

مصنف: .... ڈاکٹر مبارک علی

طبع اوّل: 2009ء

تعداد: 1000

قیمت: .... -/800 روپے

کوڈ نمبر: GNU-394

آئی ایس بی این: 978-969-37-0363-4

طابع: .... فائن بکس پرنٹرز، لاہور

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی دیگر مطبوعات کے بارے میں معلومات کیلئے رابطہ کیجئے

ویب سائٹ http://www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125

یا ای میل books@nbf.org.pk

عہد وسطیٰ کا ہندوستان
ڈاکٹر مبارک علی

ابتدائیہ

ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں لکھی گئی تین کتابوں کا یہ نیا ایڈیشن ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان کے ذریعہ طالب علموں اور عام قارئین میں ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں عمومی آگہی پیدا ہو۔

خاص طور سے یہ کوشش کی ہے شروع ہی سے طالب علم تاریخ کے بنیادی ماخذوں سے بھی واقف ہوں۔ اس لیے جگہ جگہ ان ماخذوں کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ صرف نصاب کی کتابیں ہی نہیں بلکہ تاریخ کے بارے میں سماجی، معاشی اور سیاسی معلومات بھی ان میں دی گئی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ان کتابوں کو پسند کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

لاہور

فہرست

حصہ اول

سلاطین دور حکومت

حصہ دوم

مغل دور حکومت

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

حصہ اوّل

سلاطین دور حکومت

سلاطین دہلی

محمد بن قاسم: سندھ پر حملہ	711-12
محمود غزنوی	997-1030
محمد غوری (معزالدین)	1173-1206

دہلی سلطنت

خاندانِ غلاماں	1206-1290
خلجی خاندان	1290-1320
تغلق خاندان	1320-1413-14
سید خاندان	1414-1451
لودھی خاندان	1451-1526

پہلا باب

عہد وسطیٰ کیا ہے؟

جب تاریخ میں عہد وسطیٰ یا قرونِ وسطیٰ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے مراد وہ تاریخی زمانہ ہوتا ہے کہ جو قدیم اور جدید کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس دور کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں قدیم اور جدید دونوں روایات اور خیالات کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور تاریخی عمل اس کش مکش سے گذرتا ہے، جو بالآخر ملاپ کی شکل میں ابھرتا ہے۔

ہندوستان میں عہد وسطیٰ کو آٹھویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک کے دورانیہ میں دیکھا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں عرب، ترک، اور مغل حکمراں خاندان آئے اور انہوں نے یہاں آ کر اپنی روایات کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان کا قدیم سماج نئی روایات سے کش مکش میں رہا اور اس طرح ہندوستان کی تاریخ ایک نئے دور سے گذری۔

ہندوستان کی سیاست میں اندرونی طور پر ایک تبدیلی راجپوتوں کا ابھار تھا۔ یہ جنگجو قبائل شمالی ہندوستان پر چھا گئے اور اپنی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم کر لیں جو آپس میں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتی رہتی تھیں۔

اس دوران ہندو مت نے گپت دور سے اپنے اندر جو تبدیلیاں کی تھیں، اس کے نتیجہ میں بدھ مت ہندوستان میں اپنا اثر کھو بیٹھا۔ جین مت چند طبقوں میں محدود ہو کر رہ گیا۔ ہندو مت میں بھی حالات کے تحت مختلف فرقے پیدا ہوئے جن کی وجہ سے برہمنوں کا قدیم اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سنسکرت کی جگہ اب پراکرتیں یا عوامی بولیاں ابھریں، جو آگے چل کر بڑی زبانیں بن گئیں۔

نئی تبدیلیوں کی وجہ سے ہندو دھرم میں سختیاں آ گئیں، کیونکہ وہ پرانی روایات اور رسومات کو بچانا چاہتے تھے۔ اس لئے منوسمرتی میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے لئے یہ قانون ہوا کہ وہ اس علاقہ تک رہیں گے کہ جہاں مونج گھاس اگتی ہے اور جہاں ہرن چرتے ہیں۔ انہیں سمندر پار سفر کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ اس سے ان کی ذات کے ناپاک ہونے کا

خطرہ تھا۔ خاص طور سے یونان، ایران اور ترکوں کے ملکوں میں جانے پر پابندی لگادی گئی۔ ذات پات کی اس سختی کی وجہ سے ہندو سماج میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں رہی، وہ اپنی ذات کا ایک حصہ بن کر رہ گیا۔ وطن یا علاقہ سے زیادہ اسے اپنی ذات سے لگاؤ تھا۔ اچھوت لوگ اب تک شہروں سے باہر رہتے تھے اور ہندو سماج کی ذات پات سے علیحدہ تھے۔ اس لئے ہندو سماج میں تمام فوائد اونچی ذات کے لوگوں کو ملے ہوئے تھے، نچلی ذات والے استحصال شدہ اور پسے ہوئے لوگ تھے جن کے لئے آگے بڑھنے کے تمام راستے بند تھے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

ہندوستان میں مسلمان مختلف شکلوں اور زمانوں میں آئے۔ اول آنے والوں میں عرب تاجر تھے جو جنوبی ہندوستان میں آئے اور یہاں آ کر آباد ہوئے۔ دوسری شکل میں عرب حملہ آور تھے جنہوں نے سندھ کو فتح کر کے وہاں اپنا اقتدار قائم کیا۔ تیسری شکل میں ترک فوجی اور فاتح تھے جو شمالی ہندوستان میں حملہ آور ہوئے اور یہاں جنگ و جدل کے بعد اپنی حکومتیں قائم کیں۔

ان تینوں صورتوں میں مسلمانوں کے روّیے مختلف تھے۔ جنوبی ہندوستان میں چونکہ یہ بحیثیت تاجر کے آئے اس لئے انہوں نے کوشش کی کہ وہاں کے راجاؤں اور لوگوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھیں، اس لئے ان لوگوں نے مقامی کلچر کو اختیار کر لیا اور ان کے سماج میں مل گئے۔ بحیثیت تاجر کے ان کا مفاد امن، صلح اور مذہبی رواداری میں تھا، اس لئے یہ جنگ و جدل سے دور رہے۔ اس کے برعکس سندھ اور شمالی ہندوستان میں چونکہ یہ بحیثیت حملہ آور اور فاتح کے آئے اس لئے انہوں نے خود کو مقامی لوگوں سے برتر سمجھا اور ان سے علیحدہ رہے۔ بلکہ اس بات کی کوشش کی کہ ان کے کلچر کو مفتوحہ علاقے کے لوگ قبول کریں۔
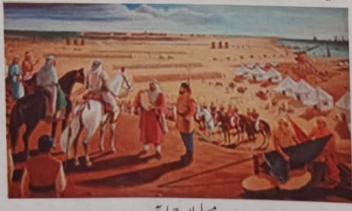
مسلمان حملہ آور

جنوبی ہند میں عرب تاجر

جنوبی ہند میں آٹھویں صدی عیسوی میں عرب تاجر آنا شروع ہوئے۔ جو لوگ کونکن میں سمندری ساحل آباد ہوئے وہ نوائسط کہلائے، جس کے معنی ہیں، نیا آنے والا۔ اس کے بعد عرب تاجروں کی آبادیوں کا پتہ مالابار میں ملتا ہے کہ جہاں انہوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں، شاید ان عورتوں کا تعلق نچلی ذات سے ہوتا ہوگا۔ ان کے ملاپ سے پیدا ہونے والے بچے ماں سے منسوب ہوتے تھے، اور یہ موپلا، ماپلا، یا مہاپلا کہلاتے تھے (مہا: بڑا۔ پلا: بچہ) تیرہویں صدی میں موپلا بطور ایک برادری کے ابھرے۔

تامل بولنے والے مسلمان کو ''الپ یائی'' کہلاتے ہیں۔ یہ عرب تاجر جنوبی ہند سے ملایا، اور انڈونیشیا میں تجارت کی غرض سے گئے، ان کی وجہ سے وہاں اسلام پھیلا، اور یہ علاقہ پرامن طور پر مسلمان ہوگیا۔

بحر ہند میں مسلمانوں کے تسلط کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں برہمنوں نے سمندر کے سفر پر پابندیاں لگا دی تھیں، اگرچہ قدیم ہندو قوانین میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، مگر آٹھویں صدی میں ذات کی ناپاکی کا ڈر اس قدر ہو چکا تھا کہ انہوں نے سمندری سفر کو ممنوع قرار دیدیا، اس پابندی کی وجہ سے نہ صرف عرب جہاز رانوں بلکہ یہودیوں اور پارسیوں کو موقع ملا کہ وہ سمندری تجارت پر قبضہ کرلیں۔

سمندری تجارت سے جنوبی ہندوستان کے حکمرانوں کو فائدہ تھا، کیونکہ ان کی آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ پہاڑوں اور دریاؤں کی وجہ سے زرعی زمینیں نہیں تھیں۔ اس لئے انہوں نے عرب تاجروں کو خوش آمدید کہا۔ سمندری ساحلی علاقوں میں جگہ جگہ ان کی بستیاں آباد ہوگئیں جہاں انہیں ہر طرح کی مذہبی آزادی تھی۔ ان کے معاملات کی دیکھ بھال ان ہی کا ایک آدمی کرتا تھا، جو ''ہنرمند'' کہلاتا تھا۔ مختلف وقتوں میں یہاں عرب سیاح بھی آتے رہے، انہوں نے اپنے سفرناموں میں جنوبی ہند کی ان بستیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

> جغرافیہ داں ادریسی پاتن کے بارے میں لکھتا ہے کہ:
> یہاں بغرض تجارت بہت سے مسلمان تاجر آتے ہیں۔ شہر کا حاکم مسلمانوں کی عزت کرتا ہے اور ان کے مال و متاع کا محافظ ہے۔ یہاں کے حاکموں کو اپنے علاقوں میں عدل و انصاف قائم رکھنے سے لگاؤ ہے۔

عربوں کی فتح سندھ

اسلام کے ابتدائی زمانے میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں سندھ پر حملے کئے گئے لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن خلیفہ ولید (715-705) کے عہد میں جب خلافت کے مشرقی صوبہ کا گورنر حجاج بن یوسف تھا، تو اس نے کامیابی کے ساتھ سندھ کی مہم کو پورا کیا۔ اس کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سندھ کی فتح سے پہلے عرب مکران کے علاقہ پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس پر قبضہ کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ خلافت کے باغیوں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ مکران اور سندھ قدیم دور میں موریہ سلطنت کا حصہ رہے تھے۔ بادشاہ اشوک کے زمانہ میں یہاں بدھ مت کا پھیلاؤ ہوا۔ لیکن گپت دور میں جب ہندو مذہب دوبارہ سے ابھرا تو یہاں بھی اس کا غلبہ ہو گیا۔ مگر سندھ میں بدھ مت 10 صدی عیسوی تک رہا۔ اس لئے بدھ مت اور ہندو مت دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ سندھ کا سماج شمالی ہند سے مختلف تھا۔ یہاں ستی کا رواج نہیں تھا، نہ ہی ذات پات کی سختیاں تھیں، نہ گائے کو مقدس مانا جاتا تھا۔

سندھ پر عربوں کے حملے کی وجہ بحر ہند میں بندرگاہ کی تلاش تھی۔ اس سے پہلے وہ 636ء میں تھانہ اور بھڑوچ کی بندرگاہوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ عرب تاجر اس وقت تک تجارت کی غرض سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں آتے جاتے تھے۔ جنوبی ہندوستان اور گجرات میں ان کی بستیاں بھی تھیں۔ جزیرہ سراندیپ میں بھی ان کی نوآبادیاں تھیں۔ جب سمندری قزاقوں نے تجارتی جہازوں کو لوٹنا شروع کیا تو عرب تاجروں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

> ایک عرب سیاح مسعودی 916 میں مہاراشٹر کے شہر چول میں آیا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ:
>
> "اس وقت چول کا حاکم جانج تھا۔ شہر میں دس ہزار مسلمانوں کی بستی تھی جو بیاسر، سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور بہت سے دوسرے ملکوں کے لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے چول میں شادی بیاہ کر کے وہاں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ان میں خاصی تعداد ممتاز تاجروں کی تھی۔"

اس لئے ان کے نزدیک سمندری راستوں کی حفاظت ایک اہم مسئلہ بن گئی۔ 12-711 میں سندھ پر محمد بن قاسم نے تیاریوں کے بعد حملہ کیا، اور دیبل، نیرون کوٹ، سیہون، برہمن آباد، اروڑ اور ملتان فتح کر لئے۔ اس کے بعد سندھ عباسی خلافت کا ایک حصہ بن گیا کہ جہاں سے اس کے انتظام کے لئے گورنر آیا کرتے تھے۔

سندھ کی فتح کے بعد یہاں عربوں کی آبادیاں قائم ہوئیں، چونکہ یہ ہندوستان کا پہلا علاقہ تھا جس پر عربوں کی

چچ نامہ یا فتح نامہ

عربوں کی فتح سندھ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں، 1216ء میں اس کا عربی سے فارسی ترجمہ علی کوفی نامی ایک شخص نے کیا۔ اس میں جہاں تاریخی واقعات ہیں، وہیں پر بہت سی فرضی باتیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ کتاب چونکہ عرب فاتحین کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس لئے محمد بن قاسم ہیرو ہے، جب کہ راجہ داہر ایک شکست خوردہ شخص ہے۔

حکومت قائم ہوئی، اس لئے یہ ہندوستان اور عربوں کے درمیان رابطہ کا باعث بنا۔ عربوں کی فتح کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بحری قزاقوں کی سرگرمیاں کم ہو گئیں، جس کی وجہ سے شہروں کی آبادی بڑھی۔ چونکہ یہاں ذات پات کے نظام میں سختی نہیں تھی، اس لئے برہمنوں کا اثر و رسوخ بھی گہرا نہیں تھا، لوگوں کا رشتہ ناطہ اپنے قبیلہ سے تھا، اس لئے جب قبیلہ کا سردار مسلمان ہوتا تو اس کے ساتھ پورا قبیلہ مسلمان ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہاں سیاسی و سماجی وجوہات کی وجہ سے اسلام پھیلا۔ سندھ میں جاٹ، مید، اور سومرہ قبائل جو خانہ بدوش تھے، عربوں کی فتح کے بعد یہ آباد ہو گئے اور کاشت کاری کو بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ اس نے سندھ کی خوش حالی میں اضافہ کیا۔ جب عباسی خلافت زوال پذیر ہونا شروع ہوئی تو یہاں چھوٹی چھوٹی خود مختار عرب سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں ہباری مشہور ہے، جن کا صدر مقام منصورہ تھا۔ ملتان میں بنو سامہ خاندان نے حکومت قائم کر لی۔

دیبل

سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل تھی، جس پر سب سے پہلے عربوں نے قبضہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں اصطخری نے لکھا ہے کہ:

"سندھ دریا (مہران) کے مغرب میں ساحل سمندر پر واقع ہے۔ تجارت کی بڑی منڈی ہے۔ سندھ بندرگاہ ہے۔ درختوں کی قلت ہے۔ کھجور بھی نہیں ہوتی ہے۔ روکھی اور وحشت ناک جگہ ہے۔ صرف تجارت کی خاطر لوگ یہاں رہتے ہیں۔"

عربوں کی سندھ کی فتح کے معاشی، اور سماجی اثرات کا اندازہ سیاحوں کے ان بیانات سے ہوتا ہے کہ جو اس زمانے میں سندھ آئے تھے۔ 967ء میں ابن حوقل کے بیان کے مطابق یہاں 24 آباد شہر تھے۔

سندھ میں اسلام سے پہلے کے تاریخی آثار کم ملتے ہیں۔ راجہ داہر کے امراء میں جاٹ اور راجپوت تھے۔ اہم قبائل میں سوڈھا، جاریجہ، اور مید تھے۔ جاٹوں کو عربی میں 'زط' کہا گیا، انہیں عراق میں بطور غلام بھیجا گیا۔

چونکہ سندھ عباسی خلافت کے مرکز سے دور تھا۔ اس لئے یہاں باغی اور منحرف لوگ آ کر پناہ لیا کرتے تھے۔ یہاں 9 صدی میں اسماعیلیوں کی آمد بھی ہوئی، جنہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ اسماعیلی اقتدار کا خاتمہ 1010ء میں ہوا کہ جب محمود غزنوی نے ملتان فتح کیا، اس کے بعد منصورہ سے ہباری خاندان کا خاتمہ کیا۔

عربوں کی فتوحات سندھ تک محدود رہیں، کوشش کے باوجود وہ اپنی فتوحات کا دائرہ نہیں بڑھا سکے۔ بالآخر شمالی ہندوستان کی فتح ترکوں کے ذریعہ ہوئی۔

منصورہ

ہباری خاندان کا صدر مقام تھا۔ سانگھڑ کے قریب اس کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ مقدسی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

''مملکت سندھ کا صدر مقام ہے۔ اور مرکزی شہر ہے ...... عمارتیں لکڑی کی ہیں۔ جامع مسجد پتھر اور اینٹ سے تعمیر کی گئی ہے...... دریائے سندھ کی ایک شاخ شہر کو گھیرے ہوئے ہے۔ باشندے خوش سلیقہ اور بامروت ہیں۔ ذہین، ہوشیار، مخیرّ، شعائر اسلام کے پابند، علم کا خوب چرچا ہے، تجارت اور کاروبار نفع بخش ہے۔''

دوسراباب

سندھ کی فتح کے بعد تقریباً تین صدیوں تک ہندوستان مسلمانوں کے حملوں سے محفوظ رہا۔ عرب فاتحین سندھ تک محدود رہے اور وہیں ان کے اقتدار میں زوال آیا، لیکن نویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا کی فتح اور وہاں پر رہنے والی قوموں کے مسلمان ہونے سے ایک نئی طاقت ابھری جو ترکوں کی تھی۔ انہوں نے جب فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو اس میں برصغیر ہندوستان بھی آ گیا۔ ترک کون تھے؟ کس تاریخی عمل سے گذر کر یہ ایک سیاسی طاقت بنے؟ اور تاریخ میں ان کا کیا حصہ ہے؟ ہم ان سوالات کا جواب دینے کے لئے ترکوں کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتانا چاہتے ہیں۔

ترک

سب سے پہلے ترک کی اصطلاح چھٹی صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبائل کے لئے استعمال ہونا شروع ہوئی۔ چینی انہیں ''تو کچ'' کہتے تھے۔ یونانیوں کے لئے ''ترکوئے'' اور عربوں کے لئے ''اترک'' تھے ایرانیوں نے انہیں ''ترکمان'' کا نام دیا۔ جب یہ ہندوستان میں آئے تو یہاں یہ ''ترک شک'' کہلائے۔

اسلامی دنیا میں ترکوں کی پہچان اس وقت ہوئی کہ جب نویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا کو فتح کیا گیا تو یہاں سے بڑی تعداد میں نوجوان ترکوں کو پکڑ کر بطور غلام بازاروں میں فروخت کیا گیا۔ اسلامی سماج میں بادشاہوں اور امراء کے لئے ترک غلاموں کو رکھنا سماجی مرتبہ کی علامت بن گیا۔ غلامی کی وجہ سے ترکوں کے بارے میں لوگوں کا رویہ یہ تھا کہ یہ غیر مہذب اور جاہل ہیں۔

اس کے بعد ان کی دوسری حیثیت بحیثیت فوجی کی تھی۔ جنہیں حکمراں اور امراء اپنے محافظ دستوں اور فوجوں میں ملازم رکھتے تھے۔ چونکہ یہ کرائے کے فوجی تھے اس لئے ان کی وفاداریاں بھی بدلتی رہتی تھیں۔ ترکوں کے بارے میں یہ دوسرا نظریہ تھا جو مسلمان سماج میں جانا جاتا تھا۔

ان کی تیسری شکل یہ تھی کہ یہ سیاسی اتار چڑھاؤ کی وجہ سے کئی ملکوں میں برسرِ اقتدار آ گئے اور اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ اس صورت میں بھی عام لوگوں نے انہیں پسند نہیں کیا اور انہیں جائز حکمراں تسلیم کرنے کے بجائے غاصب قرار دیا۔

ترکوں کے بارے میں لوگوں کی رائے کو خراب کرنے میں ایرانیوں کا بڑا حصہ ہے کیونکہ ان میں اور ترکوں میں اسلام سے قبل اچھے تعلقات نہیں تھے، اس لئے ایرانی ان کا ذکر تعصب اور نفرت سے کرتے تھے۔ ایرانی خود کو بڑا مہذب اور شستہ ذوق والا سمجھتے تھے جب کہ ترک غیر مہذب، جنگلی اور جاہل تھے۔

ترکوں کے بارے میں یہ منفی رویہ صرف عربوں اور ایرانیوں ہی میں نہیں تھا، بلکہ ہندوستان میں بھی ان کے لئے اچھے جذبات نہیں تھے۔ کیونکہ جب وہ بطور فاتح کے ہندوستان میں آئے، یہاں جنگ و جدل میں حصہ لیا، لوگوں کا قتل عام کیا، لوٹ مار کی، تو سنسکرت ادب میں ان کے بارے میں جو تذکرے ہیں، ان سے ان کے تباہی و بربادی والے کردار کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ان کی قتل و غارت گری اور لوٹ مار سے ہندوستان کو جو نقصانات پہنچے ان کا ذکر کرتے ہوئے سنسکرت کی ایک تحریر میں ہے کہ ان کی حکومت کی وجہ سے مندر خستہ حالت میں ہیں، کیونکہ اب ان مندروں میں پوجا پاٹ نہیں ہوتی ہے۔ ویرانی میں کھڑے ان مندروں کے اردگرد اب بھیڑیوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے جب کہ ایک وقت تھا کہ یہاں موسیقی کے سریلے نغمے فضا میں گونجتے رہتے تھے۔ یہ تباہی اور بربادی اس لئے ہے کہ اب ہندوستان میں جاہل اور غیر متمدن ترکوں کی حکومت ہے۔

ہندوستان میں ترکوں کے بارے میں دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ محمود غزنوی اور محمد غوری نے ہندوستان پر اس لئے حملے کئے کہ وہ یہاں اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے، اس لئے یہ لوگ مجاہد اور اسلام کے سپاہی تھے۔ انہوں نے ہندوستان فتح کر کے یہاں اسلامی حکومت قائم کی۔

ایک دوسری رائے یہ ہے کہ ان کے حملے اسلام کے لئے نہیں تھے، کیونکہ ترک حملہ آور خود اسلام سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ یہ لوگ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ اور اسلامی تعلیمات کے بجائے اپنی قبائلی رسومات اور رواج کے زیادہ پابند تھے۔ اس لئے ترکوں کی ہندوستان میں فتوحات سیاسی مقاصد کے لئے تھیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

راجپوت

راجپوت کون ہیں؟ ان کے بارے میں تاریخ میں کوئی واضح شواہد نہیں ہیں۔ 647ء میں ہرش کی حکومت کے خاتمہ پر راجپوتوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ ان کے بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ وسط ایشیا سے

آنے والی شک اور ہن قومیں تھیں جو کہ ہندوستان میں بس گئیں اور یہاں کے سماج میں مل گئیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ مقامی قبیلے بھیل اور گونڈ ہیں کہ جنہوں نے خود کو ''راج پتر'' یعنی راجہ کی اولاد کہا اور کشتریوں کی جگہ لے لی۔ کیونکہ اس کے بعد کشتری ذات اچانک سماج سے غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ راجپوت آ جاتے ہیں جو کہ جنگ جو اور لڑنے والے ہیں۔ انہوں نے خود کو 36 قبیلوں میں تقسیم کرلیا۔ راجپوتوں میں سورج بنسی (سورج کی اولاد) اور چندر بنسی (چاند کی اولاد) کی دیومالائی داستان بھی مشہور ہے۔

جوہر کی رسم

راجپوتوں میں یہ رسم تھی کہ جب وہ یہ دیکھتے تھے کہ انہیں میدان جنگ میں شکست ہو رہی ہے، تو اس موقع پر وہ اپنی عورتوں کو قتل کر دیتے تھے تاکہ وہ دشمن کے ہاتھوں نہ لگیں۔ اس کے بعد وہ زعفرانی لباس پہن کر میدان جنگ میں آتے تھے اور آخر وقت تک لڑتے ہوئے مارے جاتے تھے۔

ہندوستان میں راجپوتوں کی شہرت ان کی جنگجویانہ صلاحیتوں کی وجہ سے تھی۔ چونکہ راجپوت ریاستیں مسلسل آپس میں لڑتی رہتی تھیں، اس لئے ان جنگوں نے ان میں ''جنگی اخلاقیات'' کو تشکیل دیا۔ میدان جنگ میں بہادری، شجاعت، اور بے خوف ہو کر لڑنا، ان کے کردار کی خصوصیات ہو گئیں۔ میدان سے فرار ہونا بزدلی کی علامت تھی۔ جسم پر زخموں کے نشانات ان کی عظمت و عزت کی نشانی تھے۔ ان کی شہرت اور ناموری اسی میں تھی کہ میدان جنگ میں یا تو فتح حاصل کریں یا لڑتے ہوئے مارے جائیں۔

راجپوتوں میں، عورت عزت کی علامت تھی۔ ان کے ہاں ستی کا رواج تھا۔ شوہر کے مرنے پر اس کی بیویاں جل کر مر جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی حکمران طبقے میں عورت کو اس بات کی بھی آزادی تھی کہ سوئمبر کی رسم میں وہ اپنے شوہر کو چن سکتی تھی۔ اگرچہ آخر میں یہ رسم بھی کم ہو گئی تھی۔

ہندوستان پر جب ترکوں نے حملے کئے تو ان کا واسطہ راجپوتوں سے ہوا۔ یہ دونوں قومیں جنگ جو، لڑاکا، اور فنِ سپہ گری میں ماہر تھیں۔ اس لئے ترکوں کی فتوحات خوں ریز جنگوں اور سخت مزاحمت کے بعد ممکن ہوئیں۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ترک حملہ آور جو کہ باہر سے آئے تھے، وہ راجپوتوں سے جو کہ اپنے وطن میں تھے، کیوں کامیاب رہے؟

فتوحات کی وجوہات

ترکوں کی فتوحات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اتنی آسانی سے نہیں ہوئیں۔ انہیں راجپوتوں کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، محمود غزنوی اور محمد غوری کی فتوحات کے درمیان ڈیڑھ سو سال کا عرصہ تھا کہ جس میں ترکوں نے شمالی ہندوستان کو فتح کیا۔

راجپوتوں کی شکست کی ایک وجہ ان کے درمیان مسلسل جنگیں اور لڑائیاں تھیں، جنہوں نے ان کی توانائی اور طاقت کو ختم کر دیا تھا۔ ترکوں کو یہ آسانی ہوئی کہ انہوں نے ایک ایک کر کے ان کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو ختم کر دیا۔

ترکوں کو فن سپہ گری میں ایک سبقت یہ تھی کہ ان کے ہاں گھوڑے اچھی نسل کے ہوتے تھے، اس لئے وہ اچھے گھڑسوار تھے۔ جب کہ اہل ہندوستان گھوڑوں کے حصول کے لئے وسط ایشیا، افغانستان، اور ایران کا محتاج تھے۔ ان کی فوج میں موثر ہاتھی ہوتے تھے، مگر کبھی کبھی یہی ان کے لئے مصیبت بن جاتے تھے۔ ترکوں کے ذہن میں جنگ سے پہلے یہ خیال ضرور ہوتا ہوگا کہ اگر انہیں شکست ہوگئی تو ان کے لئے پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جب کہ مقامی لوگوں کے لئے شکست کے بعد بھی پناہ گاہیں تھیں۔ اس وجہ سے حملہ آور ترک بے جگری سے لڑتے تھے۔ ان کے لئے مال غنیمت کا حصول بھی ایک وسیلہ تھا، کیونکہ اس وقت تک فوجیوں کو باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی۔

سوئمبر

سوئمبر کی رسم کی ایک کہانی جو ہندوستان میں بہت مشہور ہے وہ راجہ جے چند کی بیٹی سنجوگتا کی ہے۔ کہانی کے مطابق اجمیر کا راجہ پرتھوی راج چوہان اس سے شادی کا خواہش مند تھا مگر چونکہ دونوں راجاؤں میں سیاسی رقابت تھی اس لئے یہ شادی ممکن نہ تھی۔ جب راجہ جے چند نے سوئمبر کی رسم منعقد کی تو پرتھوی راج چوہان کو دعوت نہ دی، بلکہ اس کا پتلہ بنوا کر سب سے آخر میں بطور ذلت رکھوا دیا۔ جب سنجوگتا پھولوں کا ہار لے کر آئی تو اس نے قطار میں کھڑے کسی راجپوت راجہ کے گلے میں یہ ہار نہیں ڈالا، بلکہ آخر میں جاکر اس پتلہ کو یہ ہار پہنا دیا۔ پرتھوی راج جو اس وقت وہاں بھیس بدلے موجود تھا، وہ سنجوگتا کو اٹھا کر، گھوڑے پر بٹھا کر وہاں سے چل دیا۔ یہ راجپوتوں کی بہادری اور رومان کی ملی جلی کہانی ہے۔

جب ایک مرتبہ ترک شمالی ہندوستان پر قابض ہوگئے تو 14 صدی میں وادی گنگا و جمنا کے ذرائع ان کے پاس آ گئے، جس کی وجہ سے مسلمان حکمراں اس قابل ہوگئے کہ وہ بڑی فوجیں رکھ سکیں اور فتوحات کے سلسلہ کو جاری رکھیں۔

ان فتوحات کے پس منظر میں سیاسی مفادات تھے۔ مگر حکمرانوں کو جہاں ضرورت پڑتی تھی وہ مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے اور سیاسی جنگوں کو مذہبی جنگیں بنا دیتے تھے تاکہ عام فوجیوں میں جنگ کے جذبات کو ابھاریں اور انہیں میدان جنگ میں ثابت قدم رکھ سکیں۔

افغان حملہ آور محمود غزنوی

محمود غزنوی (997-1030)

محمود غزنوی نے ہندوستان پر کچھ مورخوں کے نزدیک دس اور کچھ مورخ ان حملوں کی تعداد بڑھا کر سترہ کر دیتے ہیں۔ ہندوستان میں جب اس نے حملے کئے ہیں تو اس وقت ملتان، سندھ، اور مکران میں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، جب کہ شمالی ہندوستان میں راجپوت سلطنتوں کی حکمرانی تھی۔ عربوں کی فتح سندھ کے بعد تین صدیوں تک مسلمانوں کی فتوحات نہیں ہوئی تھیں۔ محمود غزنوی نے شمالی ہندوستان میں حملے کر کے وہاں راجپوت حکمرانوں کو شکستیں دیں، مگر اس نے ان علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ ہندوستان میں صرف پنجاب کو اپنی مملکت کا ایک حصہ بنایا، وہ بھی اس لئے کہ جب اس کی افواج ہندوستان میں آئیں تو پنجاب میں آ کر حملوں کی تیاری کر سکیں۔ جن اہم مقامات کو اس نے فتح کیا، ان میں بھیرا، ملتان، نگر کوٹ، تھانیسر، قنوج، متھرا، کالنجر، گوالیار اور سومناتھ قابل ذکر ہیں۔

سومناتھ کی فتح کے بارے میں بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔ یہاں کے مندر میں بت کو توڑنے کی وجہ سے اسے "بت شکن" کا خطاب ملا۔ لیکن اب تحقیق سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بعد کے مورخوں نے یہ باتیں بطور داستان کے لکھیں۔ ہندوؤں میں سومناتھ مندر کو مسمار کرنے اور اس کی دولت کے لوٹنے کے قصے بہت مشہور ہوئے، جس کی وجہ سے محمود غزنوی کی شخصیت متنازعہ بن گئی۔

سومناتھ

رومیلا تھاپر، ہندوستان کی مشہور مورخ ہیں، انہوں نے سومناتھ کی تاریخ پر تحقیق کے بعد ایک کتاب لکھی ہے "سومناتھ: تاریخ کی کئی آوازیں" اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ محمود کے زمانے کے مورخوں نے سومناتھ کے حملے اور اس کو مسمار کرنے کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ ان کے مقابلہ میں شاعروں نے اس واقعہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ 12 صدی کے فارسی ماخذوں میں مندر کی دولت کا ذکر آتا ہے، اور محمود کو بت فروش کے بجائے بت شکن والی کہانی

بیان کی جاتی ہے۔14 صدی میں جب ہندوستان میں سلاطین کی حکومت مستحکم ہوجاتی ہے تواب محمود مندر توڑنے والا یا دولت لوٹنے والا نہیں بلکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بانی ہوجاتا ہے۔

محمود غزنوی دور کا سونے کا سکہ

رومیلا تھاپر جین مت کی تحریروں اور سنسکرت کے کتبوں سے یہ ثابت کرتی ہیں کہ مندر کو مسمار نہیں کیا گیا تھا۔ محمود کے بعد یہ علاقہ عرب اور ایرانی تاجروں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا، جہاں سومناتھ اور اس کی بندرگاہ پر ان کی آبادیاں تھیں۔ سنسکرت کے کتبات میں مندر کی تباہی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ایک جگہ یہ ذکر ہے کہ مندر کے قریب ایک مسلمان تاجر نے مسجد تعمیر کرائی تھی۔ سومناتھ مندر کی تباہی اور اس کے بت کو توڑنے کو انگریزی دور میں پھیلایا گیا۔ 1842 میں جب انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کیا تو یہ اعلان کیا کہ وہ سومناتھ مندر کے ان دروازوں کو واپس لائیں گے جو محمود اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لیکن جب دروازے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ یہ ہندوستانی دست کاروں کے نہیں ہیں۔ اس لئے یہ آگرہ کے ایک اسٹور میں رکھ دیئے گئے۔

آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستوں نے ایک بار پھر سومناتھ کی بربادی کا تذکرہ کیا، تاکہ اس کو سیاسی طور پر استعمال کیا جاسکے۔

سومناتھ کا مندر

محمود غزنوی کے بارے میں مورخوں کی کئی رائیں ہیں۔ ایک رائے میں یہ ایک ایسا حملہ آور تھا کہ جس نے ہندوستان کو تباہ و برباد کیا، مندروں کو مسمار کیا، ان کی دولت کو لوٹا، ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کی بے عزتی کی، اور ہندوستان کی پرانی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔

اس کے برعکس دوسری رائے یہ ہے کہ وہ ایک بہترین جنرل اور بہادر شخص تھا، جسے کسی جنگ میں ناکامی نہیں ہوئی۔ ایک جنرل کے ساتھ ساتھ وہ ایک عظیم سیاستداں اور حکمراں تھا کہ جس نے اتنی بڑی امپائر کی بنیاد ڈالی۔

تیسری رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی فتوحات سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے جو دولت ملے، اس کی مدد سے وسط ایشیا میں فتوحات کرے۔ اس لئے اس نے ہندوستان میں سوائے پنجاب کے کسی علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ وہ ہندوستان سے نہ صرف مال و دولت لے گیا بلکہ یہاں سے کاریگر، ہنرمند، اور دستکار بھی لے گیا۔ تاکہ غزنی کو خوبصورت شہر بنانے میں ان سے مدد لے۔ چونکہ اس نے ایک بڑی امپائر کی بنیاد ڈالی تھی، اس لئے وہ مذہبی معاملات میں انتہا پسند نہیں تھا، اس نے ہندو فوجیوں کو اپنے لشکر میں ملازم رکھ رکھا تھا۔

ہندوستان میں اس کے حملوں کا ایک اثر یہ ہوا کہ شہر لاہور، ایک اہم شہر بن کر ابھرا کہ جہاں وسط ایشیا، ایران، اور عرب سے صوفیاء، علماء، اور شعراء آ کر آباد ہونا شروع ہوئے۔ محمود غزنوی کے دربار میں شعراء کی سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا۔ فارسی زبان کی اہمیت ہوگئی، اس کے بعد سے عربی زبان صرف مذہب تک محدود ہو کر رہ گئی۔ محمود نے نہ صرف فارسی زبان

فردوسی کا شاہنامہ

اس میں فردوسی نے ایران کی قدیم تاریخ کی تشکیل کر کے، ایرانی نیشنل ازم کی بنیاد ڈالی ہے۔ ایرانی قوم پرستوں کو شاہنامہ کی شکل میں ایک ایسا موثر ہتھیار ملا کہ جس کی مدد سے انہوں نے اپنی کلچرل روایات کو دوبارہ سے زندہ کیا۔

فردوسی کا شاہنامہ

ہندوستان میں مسلمان سماج نے ایرانی کلچر اور فارسی زبان کو اختیار کیا، اس لئے شاہنامہ ایک عرصہ تک ہمارے نصاب کا حصہ رہا۔

کے فروغ کی سرپرستی کی، بلکہ مشہور شعراء اور دانشوروں کو اپنے دربار میں بلا کر ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا۔ اس وجہ سے محمود غزنوی کے عہد کو فارسی زبان کے احیاء کا دور کہا جاتا ہے۔ خاص طور سے فردوسی کا شاہنامہ اسی کے زمانہ میں لکھا گیا۔

البیرونی

محمود کی فتوحات نے مشہور فلسفی اور دانشور البیرونی (وفات: 1030) کو یہ موقع دیا کہ وہ ہندوستان آئے۔ یہاں آ کر اس نے برہمنوں سے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندو مذہب، فلسفہ اور رسم و رواج کا مطالعہ کیا۔ اس کی کتاب "الہند" اس موضوع پر آج بھی ایک مستند کتاب ہے۔ اس کتاب نے ہندوستان اور مسلم دنیا کے درمیان ایک پل کا کام کیا، اور ان دو مختلف کلچروں کو آپس میں ملا کر مفاہمت کی فضا کو پیدا کیا۔

محمد غوری (1173-1206)

جب تک یہ اس کا بڑا بھائی غیاث الدین زندہ رہا، یہ شہاب الدین کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ بھائی کی وفات کے بعد جب یہ تخت نشین ہوا تو اس نے اپنا خطاب معز الدین اختیار کر لیا۔ چونکہ اس خاندان کا تعلق غور سے تھا، جو افغانستان میں واقع پہاڑی علاقہ ہے۔ اس لئے یہ غوری کہلاتے ہیں۔

محمود غزنوی کی وفات کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہندوستان پر ترکوں کا یہ دوسرا بڑا حملہ تھا۔ محمد غوری نے ابتداء میں ملتان، اچ، سندھ اور لاہور کی مسلم ریاستوں کو فتح کیا، اس کے بعد اس کی راجپوتوں سے جنگیں ہوئیں۔ محمود غزنوی کی بہ نسبت اسے دو مرتبہ انیل واڑہ، اور ترائن میں شکستیں بھی ہوئیں۔

اس کے علاوہ ہندوستان میں اس کے غلاموں نے جن میں قطب الدین ایبک اور محمد بختیار خلجی قابل ذکر ہیں، انہوں نے فتوحات کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ 1206 میں جب وہ کھوکھروں کے خلاف مہم سے واپس جا رہا تھا تو کسی نے خیمہ میں آ کر اسے قتل کر دیا۔

محمد غوری کی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے وہ کہا کرتا تھا کہ اس کے غلام اس کے جانشین ہوں گے۔ لہٰذا اس کی وفات کے بعد ہندوستان میں اس کے ترکی غلاموں کی حکومت قائم ہوئی۔

تیسرا باب

خلافت وسلطنت

تقریباً نویں صدی عیسوی میں جب بغداد میں عباسی خلیفہ کمزور ہوئے تو خلافت کے صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہونا شروع ہوگئیں۔ خلافت کے مشرقی علاقے یعنی وسط ایشیا میں جو صوبائی حکومتیں بنیں ان کے حکمرانوں نے سلطان کا خطاب اختیار کیا۔ لیکن یہ حکمراں اب بھی عباسی خلیفہ کو سیاسی اور مذہبی سربراہ تسلیم کرتے تھے، اس کا نام خطبہ میں پڑھا جاتا تھا اور سکوں پر بھی لکھا جاتا تھا۔ سلطان ایک لحاظ سے خود کو اس کا نائب سمجھتا تھا۔

محمد تغلق اور سند خلافت کے بارے میں ضیاء الدین برنی کا بیان

حاجی سعید صرصری مصر سے شہر میں آیا اور خلیفہ کی درگاہ سے سلطان کے لئے منشور، لوا (جھنڈا) اور خلعت لایا سلطان محمد نے اپنے جملہ ارکان دولت، سادات، مشائخ، علماء، معارف واکابر اور سرداروں کے ساتھ...... پاپیادہ ننگے پیر خود گیا، منشور اور خلعت کو اپنے سر پر رکھا...... پہلے جمعہ میں جب خلیفہ کا نام خطبہ میں پڑھا گیا تو سونے اور چاندی کے تنکوں سے بھرے ہوئے بہت سے طباق نچھاور کئے گئے۔

(تاریخ فیروز شاہی)

محمد بن تغلق کے زمانے کے سکے

ہندوستان میں جب ترکوں نے اپنی سلطنت قائم کی، تو سب سے پہلے التتمش (1226-1211) نے خلیفہ سے سند خلافت منگوائی تا کہ اس منظوری کے بعد اسے جائز حکمراں تسلیم کر لیا جائے۔ اگر چہ دہلی کے تمام سلاطین نے خلیفہ سے اپنی حکمرانی کی منظوری نہیں لی، مگر چند حکمرانوں نے اپنی سیاسی ضروریات کے تحت خلیفہ کی منظوری کو ضروری سمجھا، ان میں محمد بن تغلق (1351-1325) اور فیروز شاہ تغلق (1388-1351) قابل ذکر ہیں۔ خلیفہ سے منظوری کا خاص مقصد یہ تھا کہ مسلمان رعایا انہیں جائز حکمراں سمجھ کر ان کی اطاعت کرے اور ان کے خلاف بغاوت سے پرہیز کرے۔

1258 میں جب ہلاکو نے بغداد کو فتح کر کے آخری عباسی خلیفہ کو قتل کر دیا، تو عباسی خاندان کے ایک شخص کو مصر میں لیجایا گیا جہاں اسے خلیفہ کی حیثیت سے رکھا گیا۔ آخری دو سلاطین نے اسی خلیفہ سے سند خلافت لی۔

حکمراں خاندان

ہندوستان میں سلطنت کا دور 1206 سے شروع ہوتا ہے اور 1526 تک جاتا ہے کہ جب پانی پت کے میدان میں ظہیر الدین بابر ابراہیم لودی کو شکست دے کر مغل خاندان کی حکومت کو قائم کرتا ہے۔ خاندان غلاماں (1290-1206) خلجی خاندان (1320-1290) اور تغلق خاندان (15-1314-1320) کا تعلق ترکی النسل سے تھا۔ جب کہ بعد میں سید خاندان (1451-1414) نے کچھ عرصہ کے لئے حکومت کی۔ آخر میں لودی خاندان (1526-1451) افغان تھا۔ ان تمام حکمراں خاندانوں کے پاس حکومت یا اقتدار کا کوئی تاریخی جواز نہیں تھا۔ ان کے اقتدار کی بنیاد فوجی طاقت اور قوت تھی۔ اس لئے جس امیر کے پاس فوجی طاقت ہوتی تھی وہ اس کی مدد سے اقتدار کے حصول کے لئے کوشش کرتا تھا۔

التتمش کے بعد اس کے وارث اقتدار کو نہ سنبھال سکے، تو بلبن نے ناصر الدین محمود کو زہر دیکر مروا دیا اور خود تخت پر قابض ہو گیا۔ جلال الدین خلجی نے بلبن کے پوتے اور وارث کیقباد کو قتل کر کے اقتدار حاصل کیا۔ علاء الدین نے اپنے چچا جلال الدین کو قتل کیا اور تخت پر قبضہ کیا۔ اس کا وارث قطب الدین مبارک خلجی اپنے غلام خسرو کے ہاتھوں مارا گیا، تغلق خاندان کا خاتمہ امیر تیمور کے حملوں نے کیا۔

لہٰذا اس پورے عرصہ میں قتل و سازش کے ذریعہ اقتدار پر لوگ آتے رہے اور کوئی بھی حکمراں خاندان ''شاہی خاندان'' کے طور پر مستحکم نہیں ہو سکا۔ کسی سلطان نے خود کو ''ظل الٰہی'' کا درجہ نہیں دیا، بلکہ اپنی حکومت کا جواز خلیفہ وقت سے سند خلافت لے کر کیا۔

بار بار کی ان سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے ملک میں سیاسی استحکام بھی نہیں ہوا۔ چند سلاطین نے اصلاحات کیں مگر وہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں اور کوئی دیرپا اثر نہ چھوڑ سکیں۔ ان کا زیادہ وقت یا تو اپنے خلاف بغاوتوں کو کچلنے میں صرف ہوا،

یا ہمسایہ راجپوت حکمرانوں سے جنگوں میں۔ اس لئے سلاطین کی تاریخ میں جنگیں اور فتوحات کے تذکرے بہت ہیں۔ جنگوں کی مقبولیت کی وجہ سے وہ سلاطین زیادہ مقبول ہوئے کہ جو جنگ جو تھے اور جنہوں نے فتوحات کیں۔ مورخ ان سلاطین کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں کہ جنہوں نے کوشش کی کہ جنگوں سے دور رہا جائے اور ملک میں امن و امان سے رہا جائے۔ ان میں خصوصیت سے جلال الدین خلجی (1296-1290) اور فیروز شاہ تغلق (1388-1351) قابل ذکر ہیں کہ جنہوں نے جنگوں سے دور رہنے کی کوشش کی۔

حکمراں خاندانوں کی تبدیلی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ سلاطین دہلی کوئی امپائر نہیں بنا سکے۔ بلکہ ان کی حکومت شمالی ہندوستان کے محدود علاقے میں رہی۔ اگرچہ علاء الدین خلجی (1316-1296) نے جنوبی ہند کی ریاستوں پر حملے کر کے وہاں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا، وران سے خراج لے کر انہیں اسی طرح سے چھوڑ دیا۔ محمد تغلق (1351-1325) نے دولت آباد کو مرکز بنا کر جنوبی ہند میں اپنے تسلط کے لئے جدوجہد کی، مگر وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس لئے امپائر کے بجائے ہندوستان میں صوبائی حکومتیں وجود میں آئیں جن میں گجرات، جونپور، مالوہ، بنگال اور شمالی دکن قابل ذکر ہیں۔ ان صوبائی سلطنتوں نے بعد میں مغل تسلط کے خلاف زبردست مزاحمت کی۔

نظریہ بادشاہت

سلاطین دہلی کا نظریہ بادشاہت مضبوط بنیادوں پر نہیں تھا۔ اگرچہ فوجی طاقت اور قوت کی وجہ سے ان کے پاس بے حد اختیارات تھے لیکن ان کی حکمرانی کسی اخلاقی، سیاسی، اور مذہبی بنیادوں پر نہیں تھی۔ اس لئے ایک خاندان کے بعد جب دوسرا خاندان اقتدار میں آتا تو عوام اسے محض طاقت کی بنا پر حکمراں تسلیم کر لیتے تھے۔ التمش کے بعد جب اس کے جانشینوں کی نااہلی اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے بادشاہت کا ادارہ کمزور ہوا تو سب سے پہلے بلبن (1287-1266) نے اس بات کی کوشش کی کہ بادشاہت کو تاریخی واخلاقی اور سیاسی بنیادیں فراہم کرے۔ اس نے خود کو ایران کے قدیم بادشاہ افراسیاب کی اولاد بتایا تاکہ بادشاہت کا حق خاندانی طور پر مضبوط ہو۔ اس کے بعد اس نے اپنی شخصیت کے گرد ایسا حصار بنایا کہ وہ عام لوگوں سے مختلف نظر آئے۔ سلطان کی ذات رعب، دہشت، شان وشوکت اور لوگوں کو خوف زدہ کرنے والی ہوتا کہ لوگ اس کی اطاعت کریں۔ اس وجہ سے عام لوگوں میں بلبن کی ذات کی وجہ سے سلطان کا مرتبہ بڑھ گیا۔

دہلی کے سلاطین میں دوسرا شخص علاء الدین خلجی (1316-1296) تھا۔ جس نے محض اپنی ذات کی طاقت وقوت پر حکمرانی کے اصول قائم کئے اور ان پر عمل کیا۔

بلبن کا بادشاہت کے بارے میں نظریہ

بلبن کے دور کا سکہ

ضیاءالدین برنی نے بلبن کے نظریہ بادشاہت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

اس لئے کہ جن بادشاہوں کو بادشاہی کی عزت وحشمت اور دربار اور سواری کا دبدبہ اور خوف کو قائم رکھنے میں رعایا کی فرماں برداری اور سرکشوں کی اطاعت حاصل ہوتی ہے وہ نہ محبت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور نہ سخت سزاؤں کے ذریعہ۔ یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ بادشاہ کی شان وشوکت کا رعب اور اس کا خوف دور اور نزدیک کے علاقوں میں اور عوام وخواص کے دلوں پر قائم نہ ہو۔ (تاریخ فیروز شاہی)

علاءالدین کا نظریہ بادشاہت

بلبن کے برعکس علاءالدین کے نظریہ بادشاہت کو ضیاءالدین برنی نے اس کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے۔

علاءالدین کے زمانے کے سکے

اگرچہ میں علم سے بے بہرہ ہوں اور میں نے کتابیں نہیں پڑھیں......اس غرض سے کہ بغاوت نہ ہو، کیونکہ بغاوت میں ہزاروں آدمی مارے جاتے ہیں، میں ہر اس چیز کا حکم دیتا ہوں جس میں ملک کی اور عوام کی اصلاح دیکھتا ہوں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ گستاخی اور بے التفاتی کرتے ہیں اور میرے احکامات بجا نہیں لاتے تو میرے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے خلاف سخت اقدامات کروں تا کہ وہ فرماں بردار ہو جائیں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ میرے یہ احکامات مشروع ہوتے ہیں یا نامشروع (شریعت کے خلاف) جس چیز میں صلاح ملک دیکھتا ہوں اور جو مجھے مصلحتِ وقت کے مطابق نظر آتا ہے، اسی کا میں حکم دیتا ہوں۔

شاہی علامات

سلطان اپنی شخصیت کو عام لوگوں سے بلند اور علیحدہ رکھنے کی غرض سے ایسی علامات اختیار کرتا تھا کہ جن کی اجازت دوسروں کو نہیں ہوتی تھی۔ تخت نشینی کے فوراً بعد وہ اپنے لئے کسی ایک خطاب کو اختیار کرتا تھا، جیسے بلبن نے غیاث الدین، اور کیقباد نے معزالدین کے خطابات اختیار کئے۔ نیا سلطان اس کے بعد اپنے نام کا سکہ جاری کرتا تھا اور جمعہ وعیدین

کے خطبوں میں اس کا نام پڑھا جاتا تھا۔ یہ بھی دستور تھا کہ وہ اپنے لئے نیا محل تعمیر کراتا تھا۔

سلطان کی خصوصی علامات میں تخت ہوتا تھا، اس کے سر پر چتر کا سایہ ہوتا تھا، دور باش یا لکڑی کا ڈنڈا ہوتا تھا تا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو سلطان سے دور رکھا جائے۔ شاہی محل میں نوبت ہوتی تھی جو خاص خاص وقت پر بجائی جاتی تھی۔ سلطان کے استعمال کے جھنڈے ہوتے تھے، جو اس کے جلوس کے ساتھ چلتے تھے۔

جلوس وسواری

سلطان جب بھی شاہی محل سے باہر جاتا تھا تو اس کی سواری کی شان وشوکت کا دھیان رکھا جاتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ سلطان کی فوجی طاقت، دولت اور اس کے رعب و دبدبہ کو دیکھیں اور اس سے متاثر ہوں۔ اس قسم کی سواری یا تو اس وقت نکلتی تھی کہ جب بادشاہ کسی مہم پر جاتا تھا یا واپس آتا تھا، یا جمعہ اور عیدین کی نماز ادا کرنے جاتا تھا، یا شکار کی غرض سے نکلتا تھا۔ ابن بطوطہ جو کہ محمد تغلق (1325-1351) کے دورِ حکومت میں ہندوستان آیا تھا، اس نے سلطان کی سواری کا

شاہی سواری پر سوار سلطان

حال لکھا ہے کہ اس موقع پر ہاتھیوں کو سجایا جاتا ہے ان پر ریشم کی طلائی جھولیں ڈالی جاتی ہیں ان میں سے سو ہاتھی بادشاہ کی سواری کے ہوتے ہیں اور ہر ایک پر چتر ہوتا ہے جو ریشم کا بنا ہوتا ہے۔

ابن بطوطہ کی زبانی شاہی سواری کا حال

''ایک ہاتھی پر بادشاہ سوار ہوتا ہے۔ ہاتھی کے آگے غلام پیدل چلتے ہیں، ان میں ہر ایک کے سر پر ٹوپی ہوتی ہے اور کمر پر سنہری پٹی بندھی ہوتی ہے، بعض پر جواہرات لگے ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے آگے آگے نقیب ہوتے ہیں جو تعداد میں تین سو ہوتے ہیں، ان میں ہر ایک کے سر پر پوستین کی ٹوپی ہوتی ہے اور کمر میں سنہری پٹی، اور ہاتھ میں تازیانہ جس کا دستہ سونے کا ہوتا ہے۔ موذن بھی ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں۔ اور تکبیر کہتے جاتے ہیں۔''

سفر نامہ ابن بطوطہ

دربار

بادشاہت کے رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کے لئے دربار کا ادارہ ضروری تھا۔ سلاطین دہلی میں بلبن وہ پہلا سلطان تھا کہ جس نے دربار کو باقاعدہ شکل دی، اس کے ادب آداب، اصول و قوانین مرتب کئے تاکہ سلطان، امراء، اور رعایا میں فرق قائم ہو۔ دربار روز ہوا کرتا تھا، جس میں سلطان اپنے زرق برق لباس اور ہتھیاروں کے ساتھ آتا اور تخت پر بیٹھتا تھا۔ امراء کے لئے بھی لازمی تھا کہ وہ دربار میں حاضر رہیں۔ یہاں حکومت کے اہم فیصلے ہوتے تھے۔ عہدے داروں کی تقرری کی جاتی تھی، خطابات دیئے جاتے تھے، تحفے تحائف، اور خلعتیں تقسیم ہوتی تھیں۔ سفیروں کا استقبال کیا جاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

دربار میں آنے والا بادشاہ کی تعظیم کرتا تھا، اس کو جھک کر آداب بجالاتا، قدم بوسی کرتا اور وفاداری کے اظہار کے طور پر نذر پیش کرتا تھا۔

سلطان کے دربار میں امراء تحفے تحائف کے ساتھ

بلبن کے دربار کے بارے میں ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ

بلبن کا دربار

سلطان بلبن نے تخت نشینی کے پہلے اور دوسرے ہی سال سے محل و دربار کی شان و شوکت اور جلوس سواری کی عظمت و دبدبہ پر بہت زور دینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بہت سے سیستانی پہلوانوں کی ساٹھ اور ستر ہزار جیتل تنخواہ مقرر کی تھی، جو ننگی تلواریں کاندھوں پر رکھے ہوئے اس کے ہم کاب ہو کر چلتے...... (دربار میں سلطان) جس کا چہرہ خورشید کی مانند، سفید داڑھی کافور کی طرح تھی، تخت کو اس طرح زینت بخشتا اور اس پر اس طرح بیٹھتا کہ اس کے رعب سے لوگوں کے دل کانپ جاتے۔ دربار کے وقت خواص اور مقربین سلطان کے تخت کے پیچھے کھڑے ہوتے...... نقیبوں کی آوازوں کا شور اس قدر ہوتا کہ دو کوس تک سنائی دیتا۔ دیکھنے والوں کے دل اس نظارے سے لرز جاتے۔ اگر اس موقع پر دور دراز علاقوں کے سفیر اور راجہ اور رائے زادے یا مقدم آئے ہوئے ہوتے اور دربار میں ان کی زمین بوسی کرائی جاتی تو اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتے۔

(تاریخ فیروز شاہی)

جاسوسی اور سزائیں

سلاطین نے جاسوسی کے نظام کو قائم کر رکھا تھا تاکہ انہیں دور دراز کے صوبوں، سرکاری عہدے داروں، اور امراء کی سرگرمیوں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں۔ چونکہ اکثر سلاطین سازش کے ذریعہ اقتدار میں آئے تھے اس لئے ان کے لئے جاسوسی کا نظام بہت زیادہ ضروری تھا۔ خاص طور سے بلبن نے اپنی سلطنت میں یہ جال بچھا رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے لڑکے بغرا خاں کی نقل و حرکت سے بھی باخبر رہتا تھا۔ اگر کوئی عہدے دار اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتا، تو وہ اس سے فوراً باخبر ہو جاتا تھا اور حکم عدولی کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

علاء الدین خلجی بھی چونکہ اپنے چچا کو قتل کر کے بادشاہ بنا تھا، اور بعد میں اس کے خلاف کئی سازشیں ہوئیں اس لئے اس نے بھی جاسوسی کا سخت نظام قائم کیا۔ ضیاء الدین برنی نے اس بارے میں لکھا کہ جاسوسی کے نظام کی وجہ سے:
''وہ اس حد تک پہنچ گیا کہ لوگوں کے نیک و بد سے متعلق کوئی خبر علاء الدین سے پوشیدہ نہیں رہتی تھی۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی (امراء اور عہدے داروں) کے گھروں میں جو کچھ بھی ہوتا، صبح ہوتے ہی اس کی اطلاع جاسوسوں کی رپورٹ کے ذریعہ سلطان کے پاس پہنچ جاتی۔''

سزاؤں کے سلسلہ میں عہد وسطیٰ میں یہ خیال تھا کہ مختلف سماجی جرائم اور بغاوتوں کا خاتمہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب سخت سزائیں دی جائیں تا کہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں اور جرائم سے دور رہیں۔ سزاؤں میں پھانسی کی سزا بغاوت اور سخت جرائم کے نتیجہ میں دی جاتی تھی۔ یہ پھانسیاں لوگوں کے سامنے دی جاتی تھیں اور لاش کو نمایاں طور پر کئی دنوں تک اسی حالت میں لٹکا رہنے دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہاتھی کے پیروں تلے کچلوانا، شکنجے میں کسوانا، کوڑے مارنا، اور اس قسم کی دوسری سزاؤں کا رواج تھا۔ بلبن، علاء الدین خلجی اور محمد تغلق سزاؤں کے معاملہ میں بڑے سخت تھے۔

جب 1275 میں طغرل نامی ایک شخص نے بنگال میں بغاوت کی تو بلبن نے اس بغاوت کے خاتمہ پر باغیوں کو سخت سزائیں دیں۔ ضیاء الدین برنی کے مطابق: "میں نے بہت سے معمر افسروں کی زبانی سنا ہے کہ دہلی کے کسی بھی بادشاہ نے اتنے وسیع پیمانے پر سزائے موت کا حکم نہیں دیا تھا جیسا کہ بلبن نے لکھنوتی میں دیا تھا۔"

محمد تغلق کی سزائیں: ابن بطوطہ کا بیان

کبھی شاذ و نادر ہوتا تھا کہ اس کے دروازے پر کوئی شخص قتل نہ کیا جاتا تھا۔ اکثر نعشیں دروازے پر پڑی رہتی تھیں۔ یہ بادشاہ چھوٹے بڑے جرم پر برابر سزا دیتا تھا نہ اہل علم کا لحاظ کرتا تھا اور نہ شریفوں کا اور نہ صالحین کا۔ دیوان خانہ میں ہر روز سینکڑوں آدمی ہتھکڑیاں پہنے حاضر کئے جاتے تھے۔ بعض قتل کئے جاتے تھے اور بعض کو عذاب دے دیا جاتا تھا اور بعض کو مار پیٹ کی سزا دی جاتی تھی۔

(سفرنامہ ابن بطوطہ)

ابن بطوطہ محمد تغلق کے دربار میں

یادگاریں

حکمرانوں کو ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ تاریخ میں ان کی یاد باقی رہے۔ اس مقصد کے لئے جہاں دربار کے مورخ ان کے کارنامے لکھتے ہیں اور تاریخ میں ان کو اعلیٰ مقام دیتے ہیں، وہاں حکمراں اپنی زندگی میں یادگاریں تعمیر کراتے ہیں تا کہ لوگ اس نسبت سے انہیں یاد رکھیں۔ سلاطین دہلی نے بھی ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں، جن میں مسجدیں، مقبرے،

محلات، دروازے، مینار، حوض، سرائیں، قلعے، کنویں، شاہراہیں، اور باغات شامل ہیں۔

ترکوں نے جیسے ہی شمالی ہند میں فتوحات کیں، انہوں نے مسجد قوۃ الاسلام اور قطب مینار تعمیر کرائے تا کہ ان کی رعایا ان عمارتوں کو دیکھ کر ان کی طاقت، قوت، اور شان و شوکت سے متاثر ہو۔ کیونکہ عمارتیں لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوتی ہیں، اس لئے وہ سب سے زیادہ ان ہی سے متاثر ہوتے ہیں، ان عمارتوں کی بلندی، اور مضبوطی میں وہ حکمرانوں کی عظمت کو دیکھتے ہیں۔

حکمرانوں کے مقبرے اس لئے ضروری تھے تا کہ لوگوں میں بادشاہت کے تسلسل کا خیال رہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کی یادگار ان کے درمیان میں ہے۔

فیروز شاہ تغلق اور اشوک کی لاٹیں

فیروز شاہ تغلق نے جب میرٹھ اور توپرا میں اشوک کے تعمیر شدہ مینار دیکھے تو وہ ان سے بے انتہا متاثر ہوا، اور حکم دیا کہ انہیں دہلی میں لا کر نصب کر دیا جائے۔ مینار کو لانے کی تفصیل شمس سراج عفیف نے اپنی کتاب "تاریخ فیروز شاہی" میں اس طرح سے دی ہے۔

فیروز شاہ نے درخت سنبل کی چھال کے رسّے تیار کرائے اور اس درخت کے تختے تیار کئے گئے، اور یہ تمام رسّے اور تختے منارہ کے تختہ گاہ پر باندھے گئے۔ یہ احتیاط اس لئے کی گئی کہ ایسا نہ ہو کہ منارہ خم ہونے سے ٹوٹ جائے اور زمین پر گر پڑے......

اس کے بعد چالیس پہیوں کی گاڑی بنائی گئی اور گاڑی کے ہر پہیہ میں رسیاں لپیٹی گئیں اور ہزار انسان اس ستون کو اٹھانے میں لگائے گئے......اس کے بعد گاڑی چلی اور بے حد مشقت کے ساتھ دریائے جمنا کے کنارے لائی گئی۔ بادشاہ نے دریا میں تمام کشتیاں جمع کیں ......اور منارہ بے حد محنت و حکمت کے ساتھ کشتیوں پر رکھا گیا اور دریائی راہ طے کر کے یہ عجیب و غریب ستون کوشک فیروز آباد لایا گیا۔

اشوک کے دور کا تعمیر شدہ مینار جس کو فیروز شاہ تغلق نے دہلی میں لا کر نصب کیا

سلطان کی شخصیت

سلاطین دہلی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر سلطان کی شخصیت اور اس کا کردار ایک دوسرے سے علیحدہ تھا، مگر ساتھ ہی میں ان میں بہت سی باتیں مشترک بھی تھیں۔ ان میں سے کئی سلاطین شکار کے شوقین تھے، یہ شکار مشغلہ کے طور پر بھی کرتے تھے، مگر ساتھ ہی میں اس کے ذریعہ خود کو اور اپنی فوج کو مستعد اور تیار رکھتے تھے۔ ہلاکو خان نے بلبن کے بارے میں یہی کہا تھا کہ شکار کے ذریعہ وہ اپنی فوج کو حملہ اور دفاع کے لئے تیار رکھتا ہے۔

سلاطین حکومت اور انتظامی معاملات کے علاوہ رقص، موسیقی، اور دعوتوں کے ذریعہ ذہن کو تازہ رکھتے تھے۔ لیکن کچھ اس قدر ان مشاغل میں محو ہو جاتے تھے کہ سلطنت کے معاملات کو بھول جاتے تھے۔ اس کی ایک مثال بلبن کا جانشین کیقباد (1287-1290) تھا، چونکہ بلبن نے اس پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، اس لئے جب وہ حکمراں ہوا تو اس نے دربار کا نقشہ ہی بدل ڈالا، مگر اس کی قیمت اسے اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑی، کیونکہ حالات کی خرابی نے جلال الدین خلجی (1290-1296) کو یہ موقع دیا کہ اس کے خلاف بغاوت کر کے خود تخت پر قابض ہو جائے۔

کچھ سلاطین شعراء، اور علماء کی سرپرستی کرتے تھے۔ اور خوش ہو کر انہیں قیمتی تحفے تحائف دیتے تھے۔ بلبن جب تک بادشاہ نہیں بنا تھا، سخت سازشی تھا، اور ہر قسم کی عیاشی میں مبتلا تھا، مگر بادشاہ بننے کے بعد اس نے اپنے کردار کو بدل لیا۔ دربار میں وعظ کی محفلیں کراتا اور ان سے اس قدر متاثر ہوتا کہ روتا اور آہ وزاری کرتا۔ محمد تغلق بھی واعظوں کو دربار میں بلا کر ان سے وعظ سنا کرتا تھا۔

لیکن جہاں سیاسی مفادات آ جاتے تھے وہاں وہ مذہبی قوانین کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور ہر قسم کی اخلاقی اقدار کو پامال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتے تھے۔ جہاں ایک طرف وہ فیاضی وسخاوت کے مظاہر کرتے تھے، وہاں دوسری طرف ٹیکسوں کی وصولیابی میں کوئی رعایت نہیں برتتے تھے۔

چونکہ سلطان لامحدود اختیارات کا مالک ہوتا تھا، اس لئے اس خوشی وناراضگی دونوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ امراء کے لئے ان حالات میں وقت گذارنا انتہائی مشکل تھا۔ اس لئے ایسے ماحول میں خوشامد ایسا ذریعہ بن جاتی ہے کہ جس کے سہارے لوگ اپنی حیثیت برقرار رکھتے ہیں۔

سلاطین دہلی میں اصلاحات کے سلسلہ میں ہر سلطان کی اپنی جداگانہ پالیسی رہی تھی۔ بلبن نے فتوحات کی بجائے سلطنت کے اندرونی استحکام پر توجہ دی اور کوشش کی کہ سرکاری عہدے داروں کو رعایا پر ظلم وستم سے روکے۔

علاء الدین خلجی نے اقتصادی اصلاحات کے ذریعہ چیزوں کی قیمتیں مقرر کیں، اور سختی کے ساتھ ان پر عمل کرایا۔ محمد تغلق نے کچھ ایسے منصوبے تیار کئے کہ جو اس وقت کے لحاظ سے قابل عمل نہیں تھے، اس لئے اس کا تانبہ کا سکّہ، جعل سازی اور ملاوٹ کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ دولت آباد بھی سلطنت کا اہم شہر نہیں بن سکا، اس کی خراساں اور تبت کی مہمات ناکام ہوئیں، اسی طرح کسانوں پر نئے لگان کی شرح نے بغاوتوں کو جنم دیا۔ فیروز شاہ تغلق کا زمانہ ایک لحاظ سے امن کا زمانہ تھا، لہٰذا اس نے جو سماجی اور معاشی اصلاحات کیں، شاید وہ کامیاب رہی ہوں، مثلاً اس نے نئے شہر آباد کرائے، شاہراہیں، پل سرائیں تعمیر کرائیں، نہریں کھدوائیں، مدرسے قائم کئے، غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے اخراجات دیئے، کارخانہ جات قائم کر کے کاریگروں کی سرپرستی کی وغیرہ۔

فیروز تغلق اس لحاظ سے سلاطین میں منفرد ہے کہ جب نگرکوٹ کی فتح کے بعد اسے وہاں سے سنسکرت کی کتابیں ملیں کہ جن کی تعداد تین سو کے قریب تھی تو اس نے ان کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اس طرح سے اس نے ہندوستان کے مذہب، رسم و رواج اور تاریخ کو جاننے کے مواقع فراہم کئے۔

لیکن ایسا کم ہوا کہ جو اصلاحات ہوئی ہوں، ان کے دیرپا اثرات رہے ہوں۔ حکمراں کی وفات کے ساتھ اس کی اصلاحات بھی ختم ہو جاتی تھیں۔ یہ آنے والے حکمراں پر ہوتا تھا کہ وہ رعیت کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا ہے۔

ترکوں کے بعد سید اور لودی خاندانوں کی سیاسی حیثیت مستحکم نہ تھی، اس لئے سوائے سکندر لودی (1489-1517) اور کوئی سلطان قابل ذکر نہیں ہوا۔ اس کا بھی زیادہ وقت اپنی حکومت کے استحکام میں صرف ہو گیا۔

فیروز شاہ تغلق کا مقبرہ

ترک غلام

مسلمانوں کی تاریخ میں ترک غلاموں کا سیاسی کردار بڑا اہم رہا ہے۔ ترک غلاموں کو بطور محافظ سب سے پہلے عباسی خلیفہ المتوکل (847-861) نے رکھا۔ عباسی خاندان کے زوال کے دور میں جب خودمختار صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں تو انہوں نے ترک غلاموں کو فوج اور انتظامیہ میں رکھا۔ گیارہویں صدی عیسوی تک ترک غلاموں کا ادارہ اس قدر مضبوط اور ضروری ہو گیا تھا کہ تقریباً تمام مسلمان حکمران ان کو اپنے دربار اور فوج میں رکھتے تھے۔ غلاموں کے اس اثر و رسوخ میں ان کے کردار کا بڑا دخل تھا، ان کی بہادری، وفاداری اور شجاعت کی وجہ سے ان کو مقبولیت ملی ہوئی تھی، چونکہ ان کا کوئی خاندان نہیں ہوتا تھا، اس لئے یہ صرف بادشاہ کی ذات سے وفادار ہوتے تھے۔ جب غلاموں کی تعداد بڑھی تو ان کو دو درجوں میں تقسیم کیا جانے لگا، ان میں سے ایک قسم کے وہ غلام ہوتے تھے جو بادشاہ کی ذاتی خدمت میں رہتے تھے، جو غلام اپنی صلاحیت اور لیاقت سے بادشاہ کی توجہ حاصل کر لیتے تھے انہیں بہت جلد ترقی دی جاتی تھی اور یہ "غلامان خاص" یا "غلامان سلطانی" کہلاتے تھے۔

حکمرانوں اور امراء کی اس ضرورت کی وجہ سے ترک غلاموں کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ ان غلاموں کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ قبیلوں کی آپس کی جنگیں ہوتی تھیں، جن میں شکست کھانے والے قبیلے کی عورتوں، مردوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا پھر انہیں تاجروں کے ہاتھوں بیچ دیا جاتا تھا جو شہر کی منڈیوں میں لا کر ان کی بولی لگاتے تھے۔

ترک غلاموں کی مقبولیت کے پیش نظر امراء اور باج گذار حکمران، بادشاہ کو بطور تحفہ دیا کرتے تھے، سلطان کے دربار میں غلاموں کی ترقی اور عروج میں ان کی قسمت اور حالات کا دخل ہوتا تھا۔ بہت سے تاجر غلام بچوں کو خرید کر ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتے تھے تاکہ ان کی اچھی قیمت مل سکے۔

ان غلاموں کو جنہیں سلطان خریدتا تھا، ابتداء میں وہ اس کی ذاتی خدمت پر مامور ہوتے تھے جیسے ساقی خاص، چاشنی گیر، طشت دار، مشعل بردار، چتر دار، آب دار، جامہ دار، سلحہ دار، اور علم دار وغیرہ۔ جن غلاموں میں لیاقت و صلاحیت ہوتی تھی وہ فوج کے جنرل اور صوبوں کے گورنر بنا دیئے جاتے تھے۔

سلطان محمد غوری کے کوئی اولاد نہ تھی، صرف ایک لڑکی تھی، اس لئے وہ اپنے ترک غلاموں کو اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔ جب کسی درباری نے اس سے یہ سوال کیا کہ "آپ کا جانشین کون ہوگا؟" تو سلطان نے جواب دیا کہ "دوسرے بادشاہوں کے ایک یا دو لڑکے ہوتے ہیں، جب کہ میرے ہزاروں لڑکے ہیں" اس کی مراد اپنے ترک غلاموں سے تھی، یوں تو اس کے ہزاروں غلام تھے، لیکن اس کے تین غلاموں نے تاریخ میں نام پیدا کیا، یہ تاج الدین یلدوز، ایبک اور قباچہ تھے۔

امیر چہل گانہ

سلطان التتمش نے اپنے دور حکومت میں اپنے وفادار غلاموں کا ایک طبقہ تشکیل دیا تھا جو ''امیر چہل گانہ'' کہلاتے تھے، یہ غلام اس کی زندگی میں تو اس کے وفادار رہے لیکن اس کی وفات کے بعد انہوں نے ہر نئے بادشاہ کے لئے سازشیں کیں، جس کی وجہ سے ترک سلطنت انتشار کا شکار ہوگئی۔

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

> ''بندگان شمس چونکہ ایک ہی آقا کے غلام تھے اور چالیس کے چالیس ایک ہی وقت میں بلند مقام پر پہنچے تھے اس لئے وہ ایک دوسرے کی اطاعت نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے سامنے سر جھکاتے تھے اور اقطاع، لشکر اور بزرگی و مرتبے میں سب کے سب برابری اور مساوات کا مطالبہ کرتے تھے۔''

جب بلبن سلطان بنا تو اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی حکمرانی اس وقت ہوگی جب تک وہ ان امیروں کا خاتمہ نہ کردے۔ وہ خود بھی امیر چہل گانہ میں تھا، اس لئے اس گروہ کی طاقت سے بخوبی واقف تھا۔ لہٰذا اس نے ایک ایک کر کے مختلف بہانوں اور طریقوں سے ان غلاموں کو قتل کر کے ان کا زور توڑا۔

امیر چہل گانہ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان سے ترک غلاموں کا اثر و رسوخ ختم ہوگیا۔ بعد میں آنے والے حکمرانوں نے غلام تو رکھے، مگر وہ سب ترک نہیں تھے۔ ان غیر ترک غلاموں نے بھی ترقی کی جن میں خلجی دور کے ملک کافور اور خسرو خاں قابل ذکر ہیں۔

فیروز شاہ تغلق نے غلامی کے ادارے کو ایک بار پھر شروع کیا اور ان کے لئے ایک شعبہ ''دیوان بندگی'' قائم کیا۔ مگر یہ غلام ترک غلاموں کی طرح سیاست میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے۔

امراء

سلطنت کے استحکام اور اس کے انتظام کے لئے امراء کے طبقہ کا ہونا ضروری تھا۔ لیکن ہر مسلمان تخت نشین ہونے کے بعد یہ کوشش کرتا تھا کہ وہ اپنے وفادار امراء کا گروہ پیدا کرے۔ خاندان غلامان کے دور میں سلاطین نے خاص طور سے اپنے غلاموں کو ترقی دے کر انہیں امیر کا درجہ دیا اور انہیں تمام بڑے عہدے دیئے تا کہ وہ اس کے وفادار رہیں۔ التتمش کے ''امیر چہل گانہ'' اس سلسلہ کی کڑی تھے۔ لیکن ان کے علاوہ امراء کا دوسرا طبقہ بھی ہوتا تھا جو اپنے خاندان، اور خدمات

کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔

خاندان غلاماں کے زمانہ میں (1290-1206) میں صرف ترک ذات کے لوگوں کو اعلیٰ عہدے دیئے جاتے تھے باقی دوسرے لوگوں کو کم ذات، اور کم اصل سمجھا جاتا تھا۔ جب رضیہ سلطانہ (1240-1236) نے ایک غیر ترک ملک یاقوت کو اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا تو ترک امراء نے اس کے خلاف سخت غم وغصہ کا اظہار کیا۔ اس نسلی تعصب کا اظہار ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی کے مصنف نے بلبن کی زبانی اس طرح سے بیان کیا ہے۔

بلبن اور ذات و نسل

خدا تعالیٰ نے مجھ کو ایک خصوصیت بخشی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں کسی کم اصل، کمینے، رذیل اور ذلیل کو کسی شغل، مرتبے، یا عزت کی جگہ پر نہیں دیکھ سکتا، اور جوں ہی اس قسم کے لوگ میرے سامنے آتے ہیں۔ میرے جسم کی تمام رگیں حرکت میں آ جاتی ہیں اور جب حال یہ ہو کہ جیسا کہ میں نے تم سے ذکر کیا ہے، تو میں کسی کمین یا نااہل کے لڑکے کو حکومت میں جو مجھ کو خدا کی طرف سے ملی ہے، شریک نہیں کر سکتا...... چاہے وہ ہزار ہنر مند ہو۔

(تاریخ فیروز شاہی)

1290 میں جب جلال الدین خلجی نے کیقباد کو قتل کر کے اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا تو اس کے ساتھ ہی حکومت پر ترکوں کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوا اور حکومت کے عہدے دوسری نسل اور ذات کے لوگوں کے لئے کھل گئے۔ اس وجہ سے محمد حبیب نے اسے "خلجی انقلاب" کہا ہے۔ اب امراء میں جو لوگ شامل ہوئے ان میں، اول وہ امراء تھے جو "امرائے قدیم" کہلاتے تھے جن کے خاندان قطب الدین ایبک کے زمانے میں اقتدار میں تھے۔ دوسرا طبقہ "غلام امراء" کا تھا جو ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچے تھے، تیسرے درجہ میں غیر ملکی آتے تھے اور چوتھے میں ہندوستانی تھے۔

امراء کا طبقہ مراعات یافتہ اور دولت مند تھا جس کا اظہار وہ اپنی دعوتوں، جلوسوں، اور رہن سہن میں کرتے تھے مثلاً ملک الامرا فخر الدین کوتوال کے بارے میں ہے کہ یہ روز نیا لباس پہنتا تھا، اور پہنا ہوا لباس بطور انعام دیدیا کرتا تھا۔ یہی حال امراء کی بخشش اور فیاضی کا تھا۔ یہ شاعروں، علماء اور مشائخ کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ مجلسوں میں گانے والیوں، موسیقاروں اور رقاصاؤں کو انعام واکرام دینے میں یہ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

سلاطین ان کی خدمات اور وفاداری پر انہیں خطابات دیا کرتے تھے، جن میں بڑے خطابات ''خان خاناں''، ''خان جہاں''، ''خان عالم''، ''خان دوراں''، ''خان اعظم''، یا ''خان معظم'' ہوا کرتے تھے۔ ہندو امراء کو رائے یا راؤ کا خطاب دیا جاتا تھا۔

اقطاع

سلاطین دہلی کے عہد میں امراء کو زمین بطور جاگیر دی جاتی تھی، جو اس وقت ''اقطاع'' کہلاتی تھی، جنہیں یہ دی جاتی تھی وہ ''اقطاع دار'' کہلاتے تھے۔ یہ زمین موروثی نہیں ہوتی تھی، ان کے تبادلہ یا وفات پر حکومت کے پاس آ جاتی تھی۔ اقطاع دار اس زمین کی آمدنی سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا اور ضرورت پر سلطان کو فوج فراہم کرتا تھا۔ لیکن جب کمزور سلاطین آتے تھے تو اقطاع داروں کے خاندان اسے موروثی بنانے کی کوشش کرتے تھے، جیسا کہ التتمش کے بعد ہوا۔ اس لئے جب یہ بلبن کے نوٹس میں آئی تو اس نے سب کی زمینیں منسوخ کر دیں۔ مگر اس فیصلہ پر جو واویلا ہوا، اس کا ذکر ضیاء الدین برنی نے کیا ہے کہ ان امراء یا اقطاع داروں نے اپنا مقدمہ فخر الدین کوتوال کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ:

> شمس الدین کے عہد سے آج تک جو پچاس سال سے زیادہ کی مدت ہوتی ہے، دوآبہ کے اطراف میں ہمارے اقطاع تھے، جو ہم کو بادشاہ نے دیئے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ وہ ہم کو بطور انعام دیئے گئے ہیں۔ اور ہمارے اہل وعیال کی گذر بسر کا انحصار ان ہی پر تھا۔ جتنی ہم کو مقدرت تھی، لشکر کی تیاری کے لئے گھوڑے اور اسلحہ ہم دیوان عرض میں پیش کرتے تھے۔ بادشاہوں کے درباروں میں حاضری بھی دیتے تھے۔ جو لوگ اس قابل ہوتے کہ لشکر میں شریک ہوسکیں وہ لشکر میں بھی شامل ہو جاتے تھے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ پیرانہ سالی میں ہم کو یوں راندۂ درگاہ کر دیا جائے گا۔

سلطان بلبن کو جب اس صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو اس نے اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ مگر بعد میں علاء الدین خلجی نے اس نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی، مگر فیروز شاہ تغلق نے دوبارہ سے اسے مستحکم کر دیا۔ یہ نظام مغلوں کے آنے تک ہندوستان میں قائم رہا۔

سلاطین کی مذہبی پالیسی

محمد بن قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو حجاج بن یوسف سے یہ سوال پوچھا کہ سندھ کے غیر مسلموں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے؟ اس پر حجاج نے اسے جواب دیا کہ چونکہ ایران کی فتح کے بعد زرتشت کے ماننے والوں کو اہل کتاب تسلیم کر لیا تھا، لہٰذا اسی پالیسی پر عمل کیا جائے اور ان سے بطور ذمی جزیہ لیا جائے۔ اس کا مطلب تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح ہندوؤں کو بھی اہل کتاب کے زمرے میں شامل کیا جائے۔

محمد بن قاسم کی اسی پالیسی کو سلاطین دہلی نے اختیار کیا۔ سلطان التتمش کے زمانہ میں چند علماء نے اس پر ضرور اعتراض کیا، مگر یہ پالیسی جاری رہی۔ فیروز شاہ تغلق نے یہ ضرور کیا کہ اب تک برہمن جزیہ سے آزاد تھے، اس نے ان پر بھی جزیہ لگا دیا، جس پر برہمنوں کی طرف سے احتجاج بھی ہوا۔ مگر سلطان اپنے فیصلہ پر قائم رہا۔

برہمنوں کا احتجاج

اس گروہ نے کوشک کے قریب چند روز فاقہ میں بسر کیے...... لیکن جب ان کو یقین ہو گیا کہ بادشاہ اپنے ارادے میں بے حد پختہ ہے تو شہر کے تمام ہندو جمع ہوئے اور انہوں نے بالاتفاق زنار گروہ (برہمنوں) سے کہا کہ جزیہ کی وجہ سے تمہارا اس طرح ہلاک ہونا مصلحت کے خلاف ہے۔ غرض تمام ہندوؤں نے پنڈتوں اور پجاریوں کا جزیہ اپنے ذمہ لے لیا۔

(شمس سراج عفیف: تاریخ فیروز شاہی)

چوتھا باب

ہندوستانی سماج

ہندوسماج ذات پات میں تقسیم تھا، یہ تقسیم بعد میں اور زیادہ ہوگئی کہ جب ہر ذات اپنے اندر کئی تہوں میں تقسیم ہو گئی۔ اکثر ذاتوں کا تعلق ان کے پیشوں سے ہوگیا۔ کسی کے لئے بھی ذات کو تبدیل کرنا ناممکن تھا۔ مسلمانوں میں بھی طبقاتی فرق تھا جو امیر و غریب کی شکل میں تھا۔ مگر بعد میں ان کے ہاں بھی اعلیٰ و ادنیٰ ذات کا تصور آ گیا۔ جو ہندوستانی مسلمان ہوئے، انہیں ہم مذہب ہونے کے باوجود، حکمراں طبقے میں برابر کا مقام نہیں ملا۔ مسلمان سماج میں اعلیٰ طبقے اور ذات کے وہ لوگ تھے جو وسط ایشیا، ایران، عرب، اور افغانستان سے آئے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو یہ لوگ برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔

کسان

ملک کی اکثریت کا تعلق کسانوں سے تھا جو دیہات میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ان کی زندگی سب سے زیادہ مشکل اور سخت تھی کیونکہ زرعی پیداوار کا ایک بڑا حصہ لگان یا مالیہ کی صورت میں اقطاع دار یا امیر لے لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد کسان کو دوسرے اخراجات ادا کرنا ہوتے تھے، جن میں جانوروں کی دیکھ بھال، بیجوں کا فراہم کرنا، اور ضرورت پر دوسرے لوگوں سے فصل کی کٹائی میں مدد لینا۔ اگر خشک سالی ہو، قحط آ جائے، یا وبا پھوٹ پڑے تو سارے نقصان کی ذمہ داری کسان پر تھی۔ جب گاؤں سے فوجیں گذرتیں اور کھیتوں کو پامال کرتیں تو کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ انہیں اس کا معاوضہ ملتا۔ اس لئے اپنے اخراجات کے لئے وہ ساہوکار سے قرض لیتا تھا، جس میں سود کی شرح بہت زیادہ ہوتی تھی۔

اس کی زندگی انتہائی سادہ ہوتی تھی۔ پہننے کے لئے مشکل سے ایک دھوتی ہوتی تھی۔ گھر میں سوائے پلنگ کے اور

کوئی فرنیچر نہیں ہوتا تھا۔ اپنی اس قلیل آمدنی میں سے بھی وہ مندر یا پنڈت کو نذرانہ ضرور دیتا تھا۔ صدیوں سے غربت، مفلسی، اور بے بسی کی زندگی گذارنے کے بعد اس میں تبدیلی یا بغاوت کے جذبات ختم ہو گئے تھے۔ امیر خسرو نے ان کے استحصال کے بارے میں ایک جگہ کہا ہے کہ:

''تاج شاہی کا ہر موتی کسان کی آنسو بھری آنکھوں سے گرا ہوا خون کا بلوریں قطرہ ہوتا ہے۔''
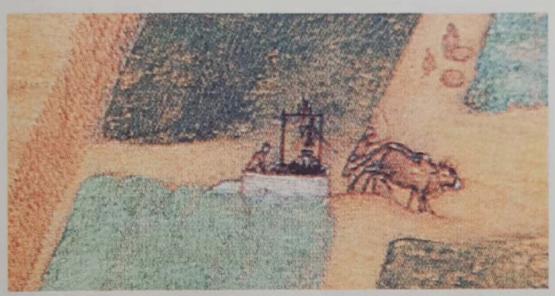
کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے

کاریگر

کسانوں کے بعد دست کار آتے تھے جو پیشہ کے لحاظ سے برادریوں میں تقسیم تھے۔ ان میں سے جو کاریگر دیہات میں تھے جیسے لوہار، بڑھئی، کمہار اور موچی، ان کی آمدنی کا ذریعہ محدود تھا اور وہ غربت کی زندگی گذارتے تھے۔ مگر جو کاریگر شہروں میں تھے، یا شاہی کارخانوں میں کام کرتے تھے ان کی آمدنی مقابلتاً بڑھی ہوئی تھی۔ شہروں کے کاریگر جو کچھ بناتے تھے ان کے گاہک زیادہ تر امراء اور حکمراں طبقے کے لوگ ہوتے تھے۔ مثلاً زیورات، اسلحہ، کپڑے، اور گھوڑوں و ہاتھیوں کا ساز و سامان بنانے والے۔ چونکہ ان پیشہ وروں کی برادریاں تھیں، اس لئے ہر پیشہ کا ہنر اور فن اس تک محدود تھا، یہ کسی دوسرے کو اس سے آگاہ نہیں کرتے تھے۔

تاجر اور دکاندار

تجارت دونوں قسم کی ہوتی تھی، یعنی ملکی اور غیر ملکی۔ چونکہ سلاطین کے آتے آتے شاہراہوں اور سڑکوں سے شہر آپس میں مل گئے تھے، اس لئے تجارتی قافلے مال واسباب لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ شہر میں بڑی بڑی منڈیاں تھیں جہاں ہر قسم کا سامان دستیاب ہوتا تھا۔ تاجر ایک طرح سے بڑا تاریخی کام سرانجام دیتے تھے، یہ نہ صرف مختلف صوبوں اور علاقوں کی اشیاء وصنعتیں بہم پہنچاتے تھے بلکہ مختلف کلچروں کو بھی آپس میں ملاتے تھے۔ اور لوگوں کو دوسرے علاقوں کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔

مگر مورخوں کے ہاں تاجروں اور دکانداروں کے بارے میں اچھی رائے نہیں ہے، ان کے نزدیک یہ منافع خور، ملاوٹ کرنے والے، کم تولنے والے، بدعنوان، اور جھوٹے تھے۔ ضیاء الدین برنی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

> بازار کے لوگ نہایت بے شرم، بے باک، مکار، قانون شکن، کمینے، دیوانے، جھوٹے اور فریبی تھے اور چونکہ اپنے سامان پر ان کو مکمل اختیار ہوتا تھا وہ نرخ کا تعین بھی خود کرتے تھے۔ اس معاملہ میں بادشاہ عاجز رہے ہیں۔ اور اس مکار قوم کے لئے خرید وفروخت کے قوانین بنانے میں وزراء نے ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھا ہے۔

سلطان علاء الدین نے بازار میں اشیاء کی قیمتیں مقرر کر کے سختی کے ساتھ ان پر عمل کرایا۔ جو لوگ مقرر شدہ قیمتوں سے زیادہ لیتے تھے انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔
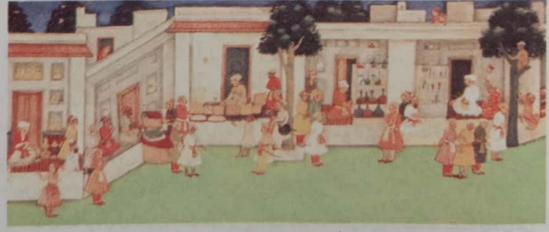
سلاطین کے دور میں تاجر اور دکاندار

علاء الدین اور بازار

سلطان علاء الدین نے غور کیا اور دیکھا کہ بازار کے لوگ اس قدر ٹھیک نہیں ہوئے جتنا کہ ان کو ہونا چاہئے تھا اور بے وقوفوں اور بچوں کو دھوکہ دینے سے وہ باز نہیں آتے، چنانچہ وہ یہ کرتا کہ غلاموں کے کم عمر اور نادان بچوں کو جو سلطانی کبوتر خانوں میں کام کرتے تھے، اپنے پاس طلب کرتا، دس دس، بیس بیس دام ان کے ہاتھوں میں دیتا اور ان کو حکم دیتا کہ وہ بازار میں جائیں۔ ان غلاموں کے لڑکوں میں سے کوئی نان اور بھنے ہوئے چنے اور کوئی نان اور یخنی خرید کر لائے۔ کوئی حلوا، کوئی ریوڑی، کوئی خربوزہ اور کوئی ککڑی خریدے اور سلطان کے سامنے لائے۔ جب وہ غلام لڑکے ہر قسم کی اشیاء خریدتے اور سلطان کے سامنے لاتے تو اس وقت رئیس (منڈی کا انچارج) کو بھی طلب کیا جاتا۔ رئیس کی موجودگی میں بچوں کی لائی ہوئی یہ اشیاء تولی جاتیں...... سرکاری نرخ کے حساب سے جن چیزوں کا وزن کم ہوتا...... اس دکاندار کو دکان سے نیچے اتروایا جاتا اور جس قدر وزن کم ہوتا اتنا ہی گوشت اس کے (جسم) سے کاٹ لیا جاتا...... اس سزا کے متواتر دیئے جانے سے بازار کے لوگ بالکل درست ہو گئے۔

(برنی: تاریخ فیروز شاہی)

عورت

عہد سلاطین میں ہندو اور مسلم سماج دونوں میں عورت کا سماجی درجہ گرا ہوا تھا، یعنی عورت کو مرد کی جاگیر سمجھا جاتا تھا۔ امراء کے گھروں میں عورتوں کو سخت پابندی میں رکھا جاتا تھا، انہیں باہر جانے کی کم ہی اجازت ملتی تھی، مگر جاتی تھیں تو پالکیوں میں جو چاروں طرف سے ڈھکی ہوتی تھیں۔ فیروز شاہ تغلق نے حکم دیا تھا کہ عورتیں شہر سے باہر نہ جائیں اور مزاروں پر نہ جائیں، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس سے بے حیائی پھیلتی ہے۔

سلطان اور امراء کئی شادیاں کرتے تھے، کنیزیں رکھتے تھے، اور عورتوں کو اپنی عزت سمجھتے تھے۔ راجپوتوں میں عورت اور عزت اس قدر ملی ہوئی تھی کہ اگر وہ جنگ میں شکست کے آثار دیکھتے تو اپنی عورتوں کو قتل کر دیتے تھے تاکہ دشمن

کے ہاتھ نہ لگیں۔

عورت کا سماجی درجہ گرا ہوا تو تھا، مگر ایک خوبصورت عورت کو حاصل کرنے کے لئے حکمراں جنگیں کرتے اور ہزاروں لوگوں کا خون بہانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ فتح کے بعد اور مال غنیمت کی طرح عورتوں کو بھی مال سمجھا جاتا تھا، اور انہیں تقسیم کیا جاتا تھا۔

سماج میں عام عورتوں کی زندگی میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ کسان عورتیں دن بھر کام کاج کرتی تھیں، نچلے طبقے کی عورتیں گھریلو مصروفیات میں وقت گذارتی تھیں۔ ہندوؤں میں ستی کا رواج تھا۔ بیوہ عورت کا سماج میں کوئی مقام نہیں تھا۔

امراء کی عورتیں اگرچہ چار دیواری میں رہتی تھیں، مگر ان کو تعلیم و تربیت کے مواقع مل جاتے تھے۔ ابتداء میں ترکوں نے اپنی روایات کے تحت عورتوں کو آزادی دے رکھی تھی، مگر بعد میں ہندوستانی روایات کے زیر اثر ان کی عورتیں بھی تمام مراعات سے محروم ہو گئیں۔ اسی وجہ سے تاریخ میں چند خواتین کا ذکر ملتا ہے کہ جنہوں نے سیاست میں حصہ لیا، اور اپنی شخصیت کو ابھارا۔ ان میں رضیہ سلطانہ قابل ذکر ہے۔

رضیہ سلطانہ (1236-1240)

سلاطین کے عہد میں رضیہ سلطانہ پہلی خاتون تھی کہ جو تخت پر بیٹھی۔ اس کے اقتدار میں آنے کا ایک اہم ذریعہ ترک امراء نہیں تھے، بلکہ اس نے دہلی کے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اس کی حمایت کریں۔ لہٰذا یہ لوگوں کی مدد سے بادشاہت تک پہنچی۔ دہلی کے عوام نے آخر وقت تک اس کا ساتھ دیا، ترک امراء نے اس کی اس لئے مخالفت کی کہ وہ ان کی جگہ غیر ترک امراء کو اقتدار میں لانا چاہتی تھی۔ وہ انتظام کے معاملات کو خوب سمجھتی تھی، اس لئے اس کے زمانہ کے ایک مورخ (منہاج سراج) نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ

رضیہ سلطانہ

''اس کے اندر وہ تمام قابل تعریف خوبیاں موجود تھیں جن کا بادشاہوں کے اندر پایا جانا ضروری ہے۔''

حکمران ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے ضروری تھا کہ پردہ میں نہ رہے۔ وہ جس تخت پر بیٹھتی تھی اسے درباریوں اور عوام سے ایک پردہ کے ذریعہ علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ خواتین محافظ اس کے پاس کھڑی رہتی تھیں۔ بعد میں رضیہ نے زنانہ لباس چھوڑ دیا اور مردانہ لباس میں عوام کے سامنے آنے لگی۔ وہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلتی تھی۔ منہاج سراج نے لکھا ہے

کہ ''لوگ اسے بالکل صاف دیکھ سکتے تھے۔''

لیکن رضیہ کے اس عمل سے ترک امراء شدید ناراض ہوئے، اس کے خلاف سازشیں ہوئیں۔ اس نے ایک باغی ترک امیر ملک التونیہ سے شادی کر کے دوسروں سے مقابلہ کیا، مگر اسے شکست ہوئی، میدان جنگ سے فرار ہونے کے بعد رضیہ اور التونیہ دونوں دیہاتیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

عام لوگوں کی روزمرّہ کی زندگی

عام لوگ سارا وقت محنت و مشقت میں گذارتے تھے۔ امراء اور عوام کے درمیان بہت فرق تھا، عام لوگوں کے مکانات کچے یا جھونپڑی نما ہوتے تھے۔ گھر میں عام طور سے ایک ہی کمرہ ہوتا تھا، جس میں روشن دان رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ گرمیوں میں یہ باہر سوتے تھے اور سردیوں میں سب ایک کمرے میں فرش پر سوتے تھے۔ نہانے کے لئے دریا یا کنویں پر جاتے تھے۔ کھانے میں باجرہ کی روٹی یا کھچڑی ہوتی تھی۔ لباس محض ایک چادر ہوتی تھی جسے جسم کے گرد لپیٹ لیتے تھے۔

ان کی زندگی میں تفریح کے موقعے بہت کم ہوتے تھے۔ تہواروں پر یہ وقت نکال کر ان سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ کھیلوں کے لئے بھی وقت کم ہی ملتا تھا۔ بیماری کی صورت میں جڑی بوٹیوں سے اپنا علاج خود کر لیتے تھے یا کسی نیم حکیم و وید کے پاس چلے جاتے تھے۔

کسان صبح سے سورج غروب ہونے تک کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کاریگر اپنے گھروں پر ہی امراء یا عام لوگوں کی ضروریات کی چیزیں تیار کرتے تھے۔ حکمراں طبقے میں عام لوگوں کے لئے حقارت کے جذبات تھے۔

شہر

شہروں کا قیام اور شہری زندگی تہذیب و تمدن کی ترقی کی علامت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ترکوں کی آمد کے بعد یہاں پرانے شہروں کے ساتھ ساتھ نئے شہر بھی وجود میں آئے۔ چونکہ ترک فاتحین شہروں میں رہتے تھے اور اپنی فوج قلعوں میں رکھتے تھے اس لئے ان کی موجودگی نے شہری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ ان کی وجہ سے شہری زندگی میں جو انقلاب آیا اس نے ہندوستانی سماج کی تشکیل پر گہرے اثرات ڈالے۔ انہوں نے اپنی ضروریات کے تحت نئے شہر آباد کئے، نئی عمارتیں اور منڈیاں تعمیر کرائیں۔ نچلی ذات کے اچھوت لوگ جنہیں اب تک شہروں میں آباد ہونے کی اجازت نہیں تھی، اب انہیں اجازت مل گئی کہ وہ شہروں میں آئیں اور آباد ہوں۔ اس کی وجہ سے شہروں کی حفاظت میں اضافہ ہوا،

یہی وجہ تھی کہ شہریوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔

اس کے علاوہ ترک حکمرانوں نے کاریگروں اور دست کاروں کو نئے نئے مواقع فراہم کئے کہ وہ ان کے لئے کارخانہ جات میں کام کریں، اس نے ان کی سماجی حالت کو بہتر بنایا۔ فیروز شاہ تغلق نے خاص طور سے کئی نئے شہر آباد کئے جن میں جونپور، حصار فیروزہ، فتح آباد، فیروز آباد اور تغلق پور قابل ذکر ہیں۔

ترکوں کی حکومت کے ہندوستان سماج پر اثرات

ترک حکمراں خاندان اپنے ساتھ ایک نیا کلچر لے کر آئے تھے، جس کی وجہ سے ہندوستان کے لوگ نئی کلچرل روایات سے واقف ہوئے اور آپس میں ساتھ رہنے کی وجہ سے ان میں رواداری کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس نے سماج کو نئے خیالات وافکار سے روشناس کرایا، مثلاً اب تک جنگ کرنے کا پیشہ کشتریوں کے پاس تھا، دوسری ذات کے لوگوں کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ ہتھیار اٹھائیں، ترکوں کی حکومت نے اس اجارہ داری کو ختم کر دیا اور فوج کی ملازمت سب کے لئے کھول دی گئی۔

جب فارسی دربار کی زبان ہوئی تو اس نے سنسکرت کی اہمیت کو گھٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی برہمنوں کی سماجی حیثیت گر گئی۔ شاہی سرپرستی کے ختم ہونے سے ان کی معاشی حالت بھی ابتر ہوگئی جب دربار سے ان کا واسطہ اور تعلق نہیں رہا تو روزگار کے لئے انہوں نے تاجروں اور دکانداروں کی ملازمتیں اختیار کر لیں۔ ان تبدیلیوں نے ہندو سماج میں برہمنوں کے اثر ورسوخ کو کم کر دیا۔

ترکوں کی فتوحات اور حکومت کا ایک اہم اثر یہ ہوا، ہندوستان میں نئی ٹکنالوجی آئی، جس نے کاریگروں کو محنت کے نئے آلات واوزار فراہم کئے۔ اس نے پیداوار میں اضافہ کیا۔ جب نچلی ذات کے کاریگروں کا معاشی درجہ بڑھا تو انہوں نے سماج میں قابل عزت مقام حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ طبقاتی طور پر اس دور میں جو کش مکش ہوئی اس کی جھلکیاں ادب میں ملتی ہیں کہ جہاں اعلیٰ ذات کے لوگ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ نچلی ذات اب ان کی ہمسری کرنے لگے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ترک حکمراں نچلی ذات کے لوگوں کو اعلیٰ عہدے دینے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن نچلی ذات کے لوگوں میں جو ایک احساس پیدا ہوا، اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

بھگتی تحریک

بھگتی تحریک کے بارے میں مورخوں کی کئی رائیں ہیں: کچھ کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد اسلام کے پھیلاؤ کو روکنا تھا،

اس مقصد کے لئے وہ نچلی ذات کے لوگوں میں مذہبی عقیدت کے جذبات کو ابھارنا چاہتی تھی تا کہ ہندو معاشرہ اس قدر مضبوط ہو جائے کہ وہ اسلام کا مقابلہ کر سکے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس تحریک کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ ہندو، مسلمان ایک ہو جائیں اور ان کے اختلافات ختم ہو جائیں۔ تیسری رائے میں دراصل اس تحریک نے ہندو سماج کے ان زخموں کو بھرنے کی کوشش کی کہ جو اسلام نے اپنی آمد پر اس پر لگائے تھے۔ روسی مورخوں کی رائے ہے کہ دراصل یہ تحریک جاگیرداری نظام کے خلاف ایک آواز تھی۔ چوتھی رائے یہ ہے کہ دراصل یہ تحریک ہندو اور مسلمان دونوں کے عقائد کو مٹا کر انہیں ایک سماج کا حصہ بنانا چاہتی تھی اور ان میں جو مذہبی تعصّبات پیدا ہو گئے تھے انہیں دور کرنا اس کا اولین مقصد تھا۔

نچلی ذات سے تعلق رکھنے والا بھگتی تحریک کا ایک شاعر

بھگتی تحریک کے جتنے بھی سربراہ یا مبلغین تھے ان کا تعلق سماج کی نچلی ذاتوں سے تھا اور انہیں اس پر فخر بھی تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے پیشہ اور ذات کو کبھی نہیں چھپایا۔ چونکہ ہندوستان کے عوام مذہبی راہنماؤں کے رویے سے تنگ آئے ہوئے تھے، اس لئے تحریک کے لیڈروں نے نہ صرف ان کی حیثیت کو چیلنج کیا بلکہ مذہبی رسومات کا بھی مذاق اڑایا، کیونکہ ان رسومات ہی کی وجہ سے پنڈت وملا دونوں سماج میں اہم بنے ہوئے تھے۔ ان کا پیغام تھا کہ ایک فرد کی نجات کے لئے کسی مذہبی راہنما کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ بندہ اور خدا کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ خدا سے محبت کی جائے تو دوسروں سے نفرت ختم ہو جائے گی، یہ انسانی محبت ہے جو لوگوں کو ذات پات سے بالاتر ہو کر آپس میں ملاتی ہے۔

اپنی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے تحریک کے راہنماؤں نے شاعری کو اختیار کیا، کیونکہ اس کے ذریعہ موثر انداز میں لوگوں تک بات پہنچائی جا سکتی تھی۔ لوگ ان باتوں کو آسانی سے یاد بھی کر لیتے تھے۔ اپنی بات کو پھیلانے کے لئے یہ لوگ گاؤں گاؤں گئے، لوگوں کو اکٹھا کیا، اور ان کے سامنے شاعری میں اپنے پیغامات پہنچائے۔

انہوں نے شہروں کے بجائے اپنی توجہ گاؤں اور دیہات پر رکھی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شہر بدعنوانیوں اور خرابیوں سے بھرے پڑے ہیں، یہاں کے رہنے والوں میں ان کی تعلیمات کا اتنا اثر نہیں ہو گا جس قدر دیہات کے عوام پر، جو دین اور سماج کے ستائے ہوئے، اور مفلسی وغربت میں مبتلا تھے۔ ان کی تعلیمات نے ان لوگوں میں یہ ہمت پیدا کر دی کہ وہ زمانے کی سختیوں کو برداشت کر لیں۔

آگے چل کر بھگتی تحریک دو فرقوں میں بٹ گئی تھی: ایک سگون کہلایا اور دوسرا نرگون۔ سگون فرقے کے لوگ مندروں

میں جانے اور بتوں کی پوجا کرنے لگے، جس کی وجہ سے یہ ہندو مت میں مل گئے۔ نرگون فرقے کے لوگ نہ تو کسی مندر میں جاتے تھے اور نہ ہی کسی بت کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک خدا یا بھگوان ہر شخص کے دل میں رہتا ہے۔ اس فرقے کے ماننے والوں میں کاریگر، دکاندار، اور نچلی ذات کے لوگ زیادہ تھے۔ ان کا سب سے بڑا گرو بھگت کبیر تھا۔

بھگت کبیر (1398-1448)

کبیر کا تعلق جولاہوں کے خاندان سے تھا، یہ لوگ آہستہ آہستہ مسلمان ہو گئے تھے، مگر اپنی روزمرہ کی زندگی میں انہوں نے اپنی ہندوانہ رسومات اور طور طریق برقرار رکھے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ انہیں حقارت سے دیکھتا تھا اور انہیں پورا مسلمان نہیں سمجھتا تھا۔ انہیں سماج میں ذلیل کرنے کے لئے ان کے بارے میں یہ بھی مشہور کر رکھا تھا کہ جولاہے بیوقوف ہوتے ہیں۔ کبیر نے اس بارے میں اپنی شاعری میں جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ کبیر کو اپنی ذات پر فخر تھا، اور وہ انسانیت کو ذات پات سے بلند ہو کر دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

بھگت کبیر داس

چونکہ کسی بھی مذہب نے نچلی ذات کے لوگوں کو برابری اور عزت نہیں دی، اس لئے کبیر کا رویہ ان کی جانب انتہائی تلخ ہے، وہ جوگیوں، پنڈتوں، اور مولویوں کا مذاق اڑاتا ہے کہ ان لوگوں نے مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو بانٹ رکھا ہے، ان میں نفرت پیدا کر رکھی ہے۔

کبیر نے اپنی شاعری میں عام لوگوں کو مخاطب کیا ہے۔ وہ دولت مندوں، اور حکمرانوں سے بیزار ہے۔ اگرچہ اس نے تمام مذاہب سے انکار کیا، مگر ہندو اسے بھگت مانتے ہیں، اور مسلمان پیر۔ اس کے ماننے والے کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔ اس جگہ کہ جہاں اس نے وفات پائی، 1450 میں وہاں کے نواب نے اس کا مقبرہ بنوا دیا تھا، اس کے مسلمان مرید اس مقبرے کی زیارت کرتے ہیں۔ جب کہ اس کے قریب ہی اس کی سمادھی ہے جو ہندوؤں کے لئے زیارت گاہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ سکھ بھی اس کا احترام کرتے ہیں کیونکہ ان کی کتاب "گرنتھ صاحب" میں اس کے کئی اشلوک ہیں۔

بھگت کبیر یا کبیر داس نے اپنی شاعری کے ذریعہ جو پیغام پھیلایا، اس میں انسانیت سے محبت، مذہبی تعصب سے دوری، اور خدا اور بندے کے درمیان تعلق پر زور ہے، وہ کتابی علم پر بھی تنقید کرتے ہیں، کیونکہ اسی علم کے سہارے برہمن

اور ملاّ نے لوگوں کو بیوقوف بنایا ہے۔
اگر خدا صرف مسجد میں بستا ہے تو یہ دنیا کس کی ہے؟
اگر رام صرف تیرتھ استھان میں نظر آتا ہے تو پھر اس استھان کے باہر کیا ہو رہا ہے؟
ہری پورب میں بستا ہے اور اللہ کا مقام پچھّم میں ہے۔
میں کہتا ہوں دل میں جھانک کر دیکھو، کریم اور رام دونوں یہیں ملیں گے۔
عورت و مرد اس کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔
وہ سب تمہارے اپنے روپ ہیں۔
کبیر اللہ اور رام دونوں کا ہے، وہی ہمارا گرو ہے، وہی ہمارا پیر۔
میں نے سنسکرت بھاشا پڑھ لی ہے۔ لوگو! اب مجھے گیانی کہو (لیکن اس سے کیا فائدہ) جب جب پیاس بہائے لئے جا رہی ہے اور خواہشوں کی آگ جلائے ڈال رہی ہے غرور اور تکبّر کا بوجھ سر پر اٹھائے پھرنا اور اس کے نیچے دب کر مرنا فضول ہے۔ کبیر کہتے ہیں، اس بوجھ کو پھینک دو اور پریتم کو مالک کہہ کر پکارو اور اس سے جا ملو۔
ہم نے ذات اور خاندان دونوں کو بھلا دیا ہے
ہمارا جھگڑا کسی سے نہیں رہا۔
پنڈت اور ملاّ دونوں کو نظر انداز کر دیا
آپ ہی بنتا ہوں اور آپ ہی پہنتا ہوں
اور جہاں آپ کو نہیں پاتا، وہاں جا کر گا تا ہوں
پنڈت اور ملاّ نے جو کچھ لکھا اس میں سے ہم نے کچھ نہیں لیا
اے میر (جماعت کا پیشوا) دیکھ لے میرا دل بالکل خالی ہے
اب کبیر اس منزل میں پہنچ گیا ہے کہ بہت تلاش کرنے کے بعد ملے گا
میاں تم سے کہنے کے لئے کوئی بات نہیں بنتی، ہم تو مسکین خدائی بندے ہیں تمہارے جی میں جو آئے وہ سمجھو۔ اللہ دین کا اول اصول ہے اور اس نے زبردستی کی ہدایت نہیں فرمائی ہے۔

تمہارے پیر، مرشد کون ہیں، اور کہاں سے آئے ہیں۔
روزہ رکھنے، نماز پڑھنے اور کلمہ دھرانے سے جنت نہیں ملتی ہے
کاش کوئی یہ بات جانے کہ ایک دل میں ستر کعبے موجود ہیں......

(ترجمہ: سردار جعفری)

ہندوستان میں سلاطین دہلی کی حکومت اور اس کے اثرات

تاریخ واقعات کو کئی پہلوؤں سے دیکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ واقعہ تو ایک رہتا ہے مگر اس کے بارے میں لوگوں کی رائے بدلتی رہتی ہے۔ کچھ مورخوں کا کہنا ہے کہ ترکوں کی فتوحات اور ان کی حکومت کے اثرات انتہائی مضر ہوئے۔ اس نے ہندو سماج کی آزادی کو ختم کردیا، وہ غیر ملکی اقتدار تلے آ کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔ اس کے علاوہ حملہ آوروں کے ساتھ ان کی مسلسل جنگوں نے ان کی توانائی اور ذرائع کو ضائع کیا۔ قتل و غارت گری سے ان کی آبادی بھی کم ہوگئی۔ ایک نئے مذہب نے ان کی مذہبی و روحانی اقدار کو بھی کمزور کیا۔ ابتدائی ترک حملہ آور، جن میں محمود غزنوی، اور محمد غوری ہیں، یہ ہندوستان کی دولت کو سمیٹ کر لے گئے۔

اس کے برعکس دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ سلاطین دہلی نے ہندوستان کو سیاسی طور پر مضبوط کیا اور ایک طاقت ور مرکزی حکومت قائم کی۔ ان کی وجہ سے ہندوستان کی تنہائی ختم ہوئی، اور اس کا تعلق دنیا کے دوسرے ملکوں سے جڑا، ترک اپنے ساتھ جو نئی ٹکنالوجی لائے تھے، جن میں آب پاشی، ٹکسٹائل اور کاغذ بنانے کا فن اہم تھیں، ان کی وجہ سے ہندوستان میں معاشی خوش حالی آئی، اور کاغذ کی وجہ سے انتظامی سہولتیں ہوئیں، دوسرے کلچر اور مذہب کے آنے کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں وسعت پیدا ہوئی، اور رواداری کے جذبات نے جنم لیا۔ خاص بات یہ تھی کہ یہ حملہ آور جلد ہی ہندوستان کے سماج میں مل کر ہندوستانی ہوگئے اور انہوں نے ہندوستانی رسم و رواج اور عادتوں کو اختیار کرلیا۔

ترکوں کے ساتھ ہی ہندوستان میں صوفیاء آئے۔ خاص طور سے اس عہد میں چشتیہ اور سہروردیہ سلسلے مقبول ہوئے۔ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں میں خواجہ معین الدین اجمیری، فرید الدین گنج شکر اور نظام الدین اولیاء اور سہروردیہ سلسلہ کے بانی بہاء الدین ذکریا مشہور ہیں۔

حصّہ دوم

مغل دور حکومت

مغل حکمراں

ظہیرالدین بابر	1526-1530
نصیرالدین ہمایوں	1530-1540-1555
سوری خاندان کی حکومت	1540-1555
ہمایوں (دوسری مرتبہ)	1555-1556
جلال الدین اکبر	1556-1605
نورالدین جہاں گیر	1605-1627
داور بخش	1627-1628
شہاب الدین شاہ جہاں	1628-1657
مراد بخش (گجرات میں)	1657
شاہ شجاع (بنگال میں)	1657-1660
محی الدین اورنگ زیب عالمگیر	1658-1707
اعظم شاہ	1707
کام بخش (دکن میں)	1707
شاہ عالم بہادر شاہ اول	1707-1712
عظیم الشان	1712

معزالدین جہاں دار	1712-1713
فرخ سیر	1713-1719
شمس الدین رفیع الدرجات	1719
نیکوسیر	1719
ناصرالدین محمد	1719-1748
احمد شاہ بہادر	1748-1754
عزیزالدین عالمگیر ثانی	1754-1760
شاہ جہاں سوم	1760
جلال الدین علی گوہر شاہ عالم دوم (پہلی بار)	1760
بیدار بخت	1788
شاہ عالم دوم (دوسری مرتبہ)	1788-1806
معین الدین اکبر دوم	1806-1837
سراج الدین بہادر شاہ دوم	1837-1858

پانچواں باب

مغل، مغل نہیں تھے

تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ اس نے ہندوستان میں بابر کے خاندان کے لئے مغلوں کے نام کو مقبول کر دیا، حالانکہ نسلاً یہ مغل نہیں بلکہ ترک تھے۔ بابر بذات خود مغلوں یا منگولوں کو پسند نہیں کرتا تھا، اور ''توزک بابری'' میں اس نے ان کو غیر مہذب اور ادب آداب سے عاری کہا ہے۔ یہ ضرور تھا کہ بابر کے خاندان میں چنگیز خاں کے خاندان سے شادی بیاہ کے رشتے ہوئے تھے۔ تیمور نے چنگیزی خاندان میں شادی کر کے اپنے لئے ''گورگان'' یا ''داماد'' کا خطاب اختیار کیا تھا۔ بابر کی ماں کا تعلق بھی چنگیزی خان سے تھا، اس لئے وہ اس خاندانی رشتہ پر فخر ضرور کرتے تھے مگر خود کو انہوں نے کبھی مغل نہیں کہا۔

سب سے پہلے مغل کا نام دینے والے ایک صوفی شیخ عبدالقدوس گنگوہی تھے جنہوں نے 1538 میں اس خاندان کے لئے شاید غلطی سے اس نام کا استعمال کیا۔ بعد میں تاریخ فرشتہ کے مصنف ہندوشاہ قاسم اور منتخب اللباب کے مصنف خافی خاں نے اس اصطلاح کو استعمال کیا۔ آگے چل کر یورپی سیاحوں اور تاجروں نے اسے پوری دنیا میں پھیلا دیا، یہاں تک کہ اب مغل شان وشوکت، دولت اور طاقت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

مغل خاندان والوں نے اپنے لئے یا تو ''خاندان تیموریہ'' کی اصطلاح استعمال کی اور یا ''خاندان چغتائیہ'' کیونکہ جس علاقے سے یہ آئے تھے وہاں کے رہنے والے چغتائی ترک کہلاتے تھے۔ ہم عصر مورخوں نے ان کے لئے یہی دو نام استعمال کئے ہیں۔

مغلوں کے بارے میں مورخوں کی دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ مغل غیر ملکی حملہ آور تھے کہ جنہوں نے ہندوستان پر فوجی طاقت کے ذریعہ قبضہ کر کے یہاں حکومت کی۔ دوسری رائے میں، اگرچہ وہ غیر ملکی تھے، مگر ہندوستان میں آنے کے بعد

ہندوستانی ہو گئے تھے اور یہاں کے رسم ورواج اختیار کر کے خود کو بالکل تبدیل کر لیا تھا، اس لئے لمبے عرصہ رہائش کے بعد ان کا غیر ملکی ہونا ختم ہو گیا تھا جس طرح یہاں آریہ، شک، ہن، اور کشاں آئے اور ہندوستانی بن گئے، اسی طرح سے مغل ہندوستانی ہو گئے۔

مغل امپائر

مغل خاندان کے پہلے دو حکمراں بابر اور ہمایوں کو اتنا وقت نہیں ملا کہ وہ ابتدائی فتوحات کے بعد سلطنت کو اور پھیلاتے۔ ہمایوں کو شیر شاہ سوری (1540-1545) سے مقابلہ کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں تخت وتاج اس کے ہاتھ سے گیا اور اسے جلاوطنی کی زندگی گذارنی پڑی۔ لیکن 1555ء میں اس نے دوبارہ سے ہندوستان فتح تو کر لیا، مگر اس کے ایک سال بعد ہی اس کی وفات ہو گئی۔

مغل امپائر کی تشکیل دراصل اکبر (1556-1605) نے کی، جس نے نہ صرف فتوحات کے ذریعہ اس کو پھیلایا بلکہ ایک امپائر کے لئے جن اداروں کی ضرورت ہوتی ہے ان کو بنانے میں بھی اس کا حصہ ہے، ان اداروں میں فوج، بیوروکریسی یا منصب داری، ریونیو کا نظام، دربار کے آداب، شاہی علامات، اور کلچر کی سرپرستی شامل تھی۔ اس نے مغل امپائر کو ان مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جس کی وجہ سے بغاوتوں اور شورشوں نے بھی اس کے استحکام کو متاثر نہیں کیا۔ مغل شہنشاہ کی عزت وشان وشوکت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں اس قدر بیٹھ گئی کہ یہ 1857 تک باقی رہی۔ مغل امپائر نے نہ صرف سیاسی طور پر ہندوستان کو متحد کیا، بلکہ لوگوں میں ایک ہونے کا احساس بھی پیدا کیا اور مختلف قوموں، نسلوں، اور مذاہب کے لوگوں کو مغل امپائر کے بندھن میں باندھ دیا، اس نے نہ صرف تعمیراتی یادگاریں چھوڑیں، بلکہ ایک ایسا کلچرل ورثہ بھی چھوڑا کہ جس میں رواداری اور اشتراک تھا۔

بابر (1526-1530)

ظہیر الدین بابر کی شخصیت ایک بادشاہ ہی کی نہیں، بلکہ ایک مہم جو اور دانشور کی بھی ہے۔ اس نے فرغانہ کی آبائی سلطنت کو کھویا، اپنے جد امجد تیمور کے شہر سمرقند پر قبضہ کرنے کی کئی بار ناکام کوشش کی، بالآخر کابل پر قبضہ کر کے وہاں کی حکومت سنبھالی، اس کے بعد ہندوستان آیا اور 1526 میں پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودی (1517-1526) کو شکست دے کر ہندوستان کا مالک

ظہیر الدین بابر

بنا۔ بابر کی زندگی کی جھلکیاں اس کی اپنی لکھی یادداشت میں ملتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پندرہویں صدی میں ایک فوجی مہم جو کی زندگی کیسے گذری، اور فرغانہ سے سفر کرتا ہوا یہ کیسے ہندوستان کا بادشاہ بنا؟

بابرنامہ

یہ ''وقائع بابری'' اور ''توزک بابری'' بھی کہلاتی ہے۔ بابر نے اسے ترکی زبان میں لکھا تھا۔ اس کے پہلے حصے کو بابر نے دوبارہ دیکھا تھا اور جہاں ضرورت تھی وہاں اسے درست کیا تھا، مگر دوسرے حصہ کو دوبارہ سے نہیں دیکھا گیا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ بہت زیادہ مصروف تھا۔ توزک میں تین جگہ حالات چھٹے ہوئے ہیں۔ 1503 سے 1504 تک، 1508-1519 تک اور 1520 سے 1525 تک بابر نے اسے سادہ اور آسان زبان میں لکھا تھا۔ تاریخی واقعات کے بیان میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اس میں جن شہروں کا ذکر ہے ان میں فرغانہ، سمرقند، کابل اور ہندوستان کے شہر ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں کافی تفصیلات ہیں، جن میں اس کے دریا، پہاڑ، جانور، پرندے، پھول اور پھل شامل ہیں۔

1589 میں اکبر کے کہنے پر عبدالرحیم خانِ خاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ توزک بابری کی تاریخی اور ادبی حیثیت کی وجہ سے اس کا ترجمہ دنیا کی اہم زبانوں میں ہوگیا ہے۔

بابر اور ہندوستان کی فتح

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر اور اس کے ساتھیوں کا مقصد ہندوستان کی فتح سے یہاں کی دولت حاصل کرنا تھی، کیونکہ یہ مشہور تھا کہ ہندوستان میں سونا، چاندی، اور دوسری دولت حکمرانوں کے خزانوں میں جمع ہے۔ پانی پت (1526) کی فتح نے لودی خاندان کے خزانے ان کو دیدیئے، اس لئے اب اس کی فوج کے اکثر فوجی اور امراء واپس کابل جانے کے خواہش مند تھے کیونکہ انہیں ہندوستان کی گرمی پریشان کئے ہوئے تھی۔ مگر بابر کو اس فتح کے بعد یہ احساس ہوگیا تھا کہ ایک بڑا اور وسیع ملک اس کے قبضہ میں آ گیا ہے، اس لئے اس کو اس طرح چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اس نے اپنے سرداروں کو جمع کر کے تقریر کی کہ:

> اس دنیا میں اس وقت کسی کو اقتدار اور تسلط نہیں ملتا ہے جب تک کہ اس کے پاس ذرائع نہ ہوں، بغیر سرزمین اور فوج کے بادشاہت ممکن نہیں ہے، کئی سالوں کی محنت اور تکلیف کے بعد، کہ جس میں جگہ جگہ بے وطنی کی حالت میں پھرنا شامل ہے، میں نے اور میری فوج نے خوں ریز جنگوں کے بعد دشمن کو شکست دی ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم ان کے ملک پر قبضہ کریں۔ آخر اب ایسی کیا مجبوری

آ گئی، اور کون سی ایسی وجہ ہے کہ ہم ان علاقوں کو چھوڑ دیں کہ جن کو قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ کابل میں غربت اور مفلسی کی حالت میں رہیں؟ لہٰذا جو میرے دوست ہیں انہیں واپس جانے کے بارے میں باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

بابر کی اس تقریر کے بعد اکثریت نے اس کا ساتھ دیا، مگر اس کا گہرا دوست خواجہ کلاں ہندوستان میں رہنے پر آمادہ نہ ہوا اور واپس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے دہلی میں اپنے گھر کی دیوار پر یہ شعر لکھ دیا۔

اگر میں صحیح سلامت سندھ سے گذر جاؤں تو
مجھ پر لعنت ہو اگر میں دوبارہ سے ہندوستان کا نام لوں

بابر اور ہندوستان

ہندوستان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ وسیع ملک ہے۔ یہاں سونا چاندی بہت ہے۔ برسات میں موسم بے انتہا خوش گوار ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ہی دن میں کئی کئی دفعہ بارش ہوتی ہے۔ برسات کے علاوہ جاڑے اور گرمی کے موسم بھی لطف انگیز ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک اچھی بات یہ بھی ہے کہ یہاں پر پیشہ اور حرفت کے لوگ کثرت سے ہیں، اس لئے ہر کام کے لئے ہزاروں آدمی ہر وقت دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ باپ دادا کے وقت سے ایک ہی پیشہ میں مصروف رہتے ہیں۔

(بابر نامہ)

بابر کو اس شعر کو پڑھ کر سخت غصہ آیا اور جواب میں اس نے لکھ بھیجا کہ:

بابر، تم اس مہربان ہستی (خدا) کا شکر کرو کہ جس نے سندھ اور ہند اور بہت سی سلطنتیں عطا کیں۔

اگر تم میں (خواجہ کلاں) گرمی برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی اور تم کہتے کہ "مجھے سرد موسم چاہئے" تو غزنی اس کے لئے موجود ہے۔ (یعنی تم وہاں جا کر رہو)

بابر کو بھی ہندوستان کو سمجھنے میں وقت لگا۔ توزک میں وہ اپنے وطن کے پھل، موسم، اور تفریحات کا بار بار ذکر کرتا

ہے۔اس لئے اس نے ہندوستان میں نئے طرز کے باغات اور عمارتوں کی بنیاد ڈالنی شروع کردی۔ساتھ ہی میں اس نے ہندوستان اور اس کے سماج کو سمجھنے کی کوشش کی۔

بابر کا اردو شعر

ہندوستان میں رہتے ہوئے بابر نے تھوڑی بہت ہندی سیکھ لی تھی۔''دیوان بابر'' کے ایک قدیم نسخہ میں اس کا لکھا یہ شعر ہے جو آدھا ترکی میں ہے اور آدھا ہندی میں۔

مجھ کو نہ ہوا کچھ ہوس مونک و موتی
فقر اہلیگا بس بولغوسی پانی و روتی

ترجمہ: مجھ کو مانک وموتی (حاصل کرنے کی) کوئی خواہش نہیں،
(اس لئے کہ) فقیر کے لئے پانی وروٹی بس (کافی) ہے۔

(بحوالہ قمر رئیس: ظہیرالدین بابر)

بابر اور خاندان

بابر کو اپنے گھر والوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہندوستان کی فتح کے بعد اس نے ایک ایک گھر والے کو تحفے تحائف بھجوائے تھے۔ ہمایوں جب بیمار ہوا تو گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں لکھا ہے کہ:

''آپ نے دعا مانگی اے خدا اگر جان کا عوض جان ہوسکتی ہے تو میں یعنی بابر اپنی زندگی اور اپنی جان ہمایوں کو دیدیتا ہوں۔ اسی دن سے حضرت فردوس مکانی (بابر کا مرنے کے بعد خطاب) بیمار ہوگئے اور ہمایوں بادشاہ غسل کر کے باہر آئے اور دربار کیا۔''

مرنے سے پہلے بابر نے خاص طور سے ہمایوں سے کہا کہ:

''ہمایوں، میں تجھے اور تیرے بھائیوں، اپنے عزیزوں کو، اپنے آدمیوں کو، اور تیرے آدمیوں کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔''

بابر نے خاص طور سے ہمایوں سے کہا کہ ہر حالت میں بھائیوں کا خیال رکھنا اور انہیں تکلیف نہ پہنچانا۔ وفات کے

وقت بابر کی عمر 46 سال کی تھی۔

بابر کی وصیت

بابر نے ہندوستان کی فتح کے بعد یہ سبق سیکھا کہ یہاں حکومت کرتے ہوئے، اور رہتے ہوئے لازمی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ رواداری اور محبت کا سلوک کرنا چاہئے۔ اس نے ہمایوں کے لئے جو وصیت چھوڑی اس میں کہا گیا ہے کہ:

فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے۔ اپنی بادشاہی میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

1- مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ مت دینا۔ لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رو رعایت کے بغیر سب لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا۔

2- گائے کی قربانی سے پرہیز کرنا۔ تاکہ اس سے لوگوں کے دل میں تمہاری جگہ ہو اور وہ احسان اور شکر کی زنجیر میں تمہارے پابند ہو جائیں۔

3- کسی قوم کی عبادت گاہ کو مسمار نہیں کرنا چاہئے۔ پورا انصاف کرنا چاہئے تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن وامان رہے۔

4- اسلام کی اشاعت ظلم وستم کی تلوار کے مقابلہ میں لطف واحسان کی تلوار سے بہتر ہوگی۔

5- شیعہ سنی اختلافات کو نظر انداز کرتے رہو، کیونکہ اس سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔

6- اپنی رعیت کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور کمزوری سے محفوظ رہے۔

ہمایوں (1540-1530، 1556-1555)

ہمایوں

ہمایوں کو کتابوں سے دلچسپی تھی، وہ ستاروں کی چالوں سے حالات کا جائزہ لیتا تھا، اس کا مشغلہ تھا کہ ہفتہ کے سات دنوں کو سات قسموں میں تقسیم کر کے ہر دن کے لئے نیا لباس اور رنگ منتخب کرتا تھا۔ گھر والوں سے اس کا رویہ محبت والا تھا، امراء سے دوستانہ طریقہ سے پیش آتا تھا۔ جنگ، فتوحات، اور لڑائی جھگڑوں سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ بابر کی وصیت کے مطابق سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کر کے بھائیوں کو دیدیا۔ کامران مرزا جسے کابل ملا تھا، اس پر مطمئن نہیں ہوا اور پنجاب پر قبضہ کر کے ہمایوں کی تعریف میں چند شعر بھیج
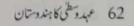
دیئے تو خوش ہوکر اس نے یہ صوبہ بھی اسے دیدیا۔ مورخ ہمایوں کے اس کردار اور اس کے عمل کو "سخت سیاسی غلطیاں" کہتے ہیں۔ اگر وہ اورنگ زیب کی طرح بھائیوں کو قتل کرا دیتا، تب بھی تاریخ اسے معاف نہیں کرتی۔ اس کو جنگ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو مجبوراً اور وہ بھی بے دلی سے۔ اس لئے نہ تو اسے گجرات میں بہادر شاہ کے خلاف کامیابی ہوئی اور نہ شیر شاہ سے وہ جیت سکا۔

مغلوں نے ہندوستان کی حکومت افغانوں سے چھینی تھی، لہٰذا وہ ان سے خوش نہ تھے، جب انہیں شیر شاہ جیسا سیاستدان، جنرل، اور ہوشیار شخص مل گیا تو افغان مغلوں کے خلاف ہو گئے۔ ہمایوں کو چوسہ کے مقام پر 1539ء میں شکست دی۔ اس کے ساتھ دوسری جنگ جو 1540 میں قنوج کے مقام پر ہوئی، اس میں شکست کھا کر ہمایوں راجپوتانہ اور سندھ کی طرف بھاگ گیا۔

ہمایوں اور نظام سقّہ

جب ہمایوں چوسہ کی شکست کے بعد فرار ہوا تو دریا پار کرتے ہوئے جب وہ ڈوب رہا تھا تو اس کو نظام نامی سقہ نے بچالیا۔ اس کے بارے میں گلبدن بیگم "ہمایوں نامہ" میں لکھتی ہے کہ:

اس خدمت کے صلہ میں آپ نے اس سقے کو تخت پر بٹھادیا...... اس سقہ کو تخت پر بٹھا کر آپ نے حکم دیا کہ سب امراء اس کے سامنے کورنش (آداب) کریں اور اس کا جو جی چاہے کسی کو دے اور جس کسی کو چاہے منصب عطا کرے۔ دو دن کے لئے اس سقہ کو بادشاہی دی گئی۔

ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم

جب ہمایوں سندھ میں کسی مدد کی تلاش میں پھر رہا تھا تو مرزا ہندال کے گھر میں اس نے پہلی مرتبہ حمیدہ بانو کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا۔ مگر جب دوبارہ اس نے حمیدہ بانو سے ملنا چاہا تو بقول گلبدن بیگم کہ: "حمیدہ بانو بیگم نہ آئیں اور کہلا بھیجا کہ اگر آداب کی غرض ہے تو میں پہلے ہی اس دن آداب بجالا چکی ہوں۔ اب دوبارہ کس لئے آؤں۔"

ہمایوں حمیدہ بانو سے شادی پر بضد تھے۔ گلبدن بیگم اس کا حال لکھتی ہیں:

"غرض چالیس دن تک حمیدہ بانو بیگم کی طرف سے حیل و حجت رہی اور وہ کسی

طرح سے راضی نہیں ہوتی تھیں۔ آخر میری والدہ دلدار بیگم نے ان سے کہا، آخر کسی نہ کسی سے تو تم بیاہ کرو گی، پھر بادشاہ سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے؟

بیگم نے جواب دیا۔ ہاں میں کسی ایسے سے کروں گی جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے۔"

بالآخر ہمایوں اور حمیدہ بانو بیگم کا نکاح سندھ کے چھوٹے سے شہر پاتر میں ہوا۔

اکبر کی پیدائش

ہمایوں سندھ میں ادھر سے ادھر پھرتے رہے، پھر جیسلمیر کا رخ کیا، مگر جب اسے پتہ چلا کہ وہاں کا راجا اسے گرفتار کر کے شیر شاہ کے حوالے کرنا چاہتا ہے تو وہ پھر سندھ کی طرف آیا، اس بار معہ خاندان کے امرکوٹ کے قلعہ میں رہا۔ راجہ نے پورے قافلہ کا استقبال کیا۔ گلبدن بیگم نے امرکوٹ کے بارے میں لکھا کہ "اکثر چیزیں یہاں بہت سستی تھیں۔ ایک روپیہ میں چار بکرے آجاتے تھے۔ رانا نے حضرت بادشاہ کی خدمت میں بہت سے تحفے بھجوائے اور ایسی شائستہ خدمات بجالایا کہ کس زبان سے بیان کی جائیں۔ غرض کچھ دن یہاں عیش و آرام سے گذارے۔"

ہمایوں حمیدہ بانو بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑ کر بھکر روانہ ہوئے، یہیں 23 نومبر 1542ء کو اکبر پیدا ہوا۔

ہمایوں سندھ سے قندھار گیا۔ اسے امید تھی کہ بھائی مدد کریں گے، مگر خبر ملی کہ عسکری مدد کرنے کے بجائے اس پر حملہ کرنے آ رہا ہے اس لئے 1543 میں وہ اکبر کو کیمپ میں چھوڑ کر ایران چلا گیا، جہاں ایران کے بادشاہ شاہ طہماسپ نے اس کی مدد کی، اس نے اول 1545 میں قندھار فتح کیا اور 1550 میں کابل۔
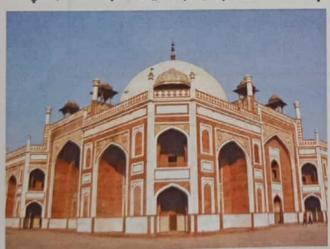
1554 میں اس نے دوبارہ سے ہندوستان فتح کر لیا۔ مگر اسے زیادہ عرصہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا اور 1556 میں سیڑھیوں سے گر کر انتقال کر گیا۔

ہمایوں کا مقبرہ

شیر شاہ سوری (1540-1545)

اصل نام فرید خاں تھا، ایک افغان جاگیردار کا بیٹا تھا۔ سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آ کر گھر چھوڑ دیا، جب بابر ہندوستان آیا تو اس کی ملازمت اختیار کی اور بہار کا گورنر بنا دیا۔ حالات سے فائدہ اٹھا کر اس نے خودمختاری اختیار کر لی۔ 1526ء کی پانی پت کی شکست کے بعد جو افغان بکھر گئے تھے انہیں اکٹھا کیا، اور زبردست فوج تیار کی، جس نے 1539ء میں ہمایوں کو شکست دی۔ اس نے آگرہ و دہلی پر قبضہ کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، کالنجر میں بارود کی سرنگ پھٹنے سے اس کی موت واقع ہوئی۔

شیر شاہ سوری کے زمانے کے سکے

شیر شاہ بہت اچھا منتظم تھا۔ اس نے سلطنت کو منتظموں اور ضلعوں کو پرگنوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر پرگنہ میں ایک فوجدار، ایک خزانچی، اور ایک امین اور ایک منصف مقرر کئے تھے۔ دو منشی ہوا کرتے تھے۔ ایک ہندی اور دوسرا فارسی میں حساب کتاب لکھتا تھا۔

اس نے تمام ملک کی زرعی زمین پیمائش کرا کے، لگان مقرر کیا۔ گاؤں کے عہدے دار اس کے ذمہ دار تھے کہ ان کے علاقوں میں جرائم نہ ہوں۔ شیر شاہ نے سڑکیں تعمیر کرائیں، ان میں سے ایک سنارگاؤں سے دریائے سندھ کے کنارے رہتاس تک جاتی تھی۔ دوسری سڑکیں، آگرہ سے برہانپور، آگرہ سے بیانہ، چتوڑ اور لاہور سے ملتان تک تھیں۔ ان سڑکوں پر سایہ دار درخت لگوائے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے سرائیں تعمیر کرائیں۔ ان سڑکوں کی وجہ سے نہ صرف تجارت بڑھی، بلکہ گاؤں و دیہات بھی الگ نہیں رہے اور وہ بھی ان سڑکوں کی وجہ سے شہروں سے مل گئے۔

شیر شاہ نے اپنی ہندو اور مسلمان رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کیا۔ ہندوؤں کو اونچے عہدے دیئے، اور کوشش کی کہ ملک میں امن و امان رہے اور لوگ خوش حال رہیں۔

اگر شیر شاہ حادثہ میں نہیں مرتا تو وہ یقیناً سلطنت کو اس قدر مضبوط کر دیتا کہ مغلوں کا دوبارہ آنا ناممکن ہو جاتا۔ شیر شاہ کے جانشین اس قابل نہ ہوئے کہ وہ مغلوں کا مقابلہ کرتے، اس وجہ سے ہمایوں نے 1555ء میں دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔

چھٹا باب

مغل ریاست اور اکبر

مغل ریاست کی تشکیل اکبر (1605-1556) کے زمانہ میں شروع ہوئی، اور اس نے اس کے مختلف اداروں کی بنیاد ڈال کر اسے مضبوط بنایا۔ چونکہ بابر اور ہمایوں کو اتنا وقت نہیں ملا تھا کہ وہ سلطنت کو وسیع کرتے اور اس کے اداروں اور روایات کو بناتے۔ اکبر نے نہ صرف مغل امپائر کی بنیاد رکھی، بلکہ اس امپائر میں رہنے والی مختلف قوموں، ان کے مذاہب اور ان کی کلچرل روایات کو بھی ایک سلسلہ میں جوڑ دیا۔

مغل ریاست کی بنیاد اکبر کے نظریہ بادشاہت پر رکھی گئی۔ بادشاہت کے بارے میں تین نظریئے بیان کئے جاتے ہیں: ایک یہ کہ بادشاہ کے پاس تمام اختیارات ہوتے ہیں، اس کی ذات سب سے بلند ہوتی ہے۔ لہٰذا رعایا کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کے احکامات کو مانے اور ان سے انکار نہ کرے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بادشاہ اپنے اختیارات کو استعمال

تین مغل بادشاہ، اکبر (درمیان میں)، جہانگیر (بائیں جانب) اور شاہ جہان (دائیں جانب)

کرنے کے لئے ایک طاقت ور عہدے داروں کا طبقہ تیار کرتا ہے، یعنی نوکر شاہی بناتا ہے، اس لئے بادشاہ اور نوکر شاہی مل کر حکومت کرتے ہیں۔ تیسرا نظریہ تھا کہ چونکہ بادشاہ کے پاس فوجی طاقت ہوتی ہے، اس لئے وہ کسی بڑے جاگیردار، یا جاگیرداروں کی جماعت کو ابھرنے نہیں دیتا کہ جو اس کے اقتدار یا اختیارات کو چیلنج کریں۔

اکبر نے جب مغل ریاست کی تشکیل کا کام شروع کیا، تو اس نے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھایا، اور جیسے جیسے ضروریات آتی گئیں، ان کے تحت وہ نئے ادارے بناتا گیا، ان میں تبدیلیاں بھی کرتا گیا، اور اضافے بھی۔ مغل ریاست کی بنیاد اس کے نظریہء بادشاہت پر تھی۔

نظریہء بادشاہت

اکبر کے سامنے بادشاہت کے تین ماڈلز تھے: ایرانی، منگولی، اور ہندوستانی۔ ایرانی نظریہ میں بادشاہ دوسرے لوگوں سے برتر تھا۔ دوسری روایت چنگیز خان کے حوالے سے آئی کہ جس میں منگول خان دوسرے تمام لوگوں سے بلند تھا، بادشاہت کا یہی تصور ہندوستان میں تھا۔ بادشاہ کی ذات اس لئے اعلیٰ ہو جاتی تھی کیونکہ اسے الٰہی قوت کی حمایت حاصل ہوتی تھی۔ اس وجہ سے بادشاہ سے بغاوت کرنا سب سے بڑا جرم تھا۔

اکبر نے اپنے بادشاہت کے نظریہ میں ان تینوں کو آپس میں ملا دیا۔ لیکن اس نے ان میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔ مثلاً منگولوں اور تیموریوں میں یہ روایت تھی کہ بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت اس کے لڑکوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ ہندوستان میں ہمایوں نے اس پر عمل کیا، اور سلطنت کو بھائیوں میں بانٹ دیا۔ اس تقسیم کی وجہ سے اختیارات بھی کئی لوگوں کے پاس چلے جاتے تھے، اور تخت کو حاصل کرنے کے لئے خانہ جنگی نہیں ہوتی تھی۔ دوسری روایت تیموریوں میں یہ تھی کہ نابالغ بھی بادشاہ ہو سکتا تھا، اس کے لئے خاندانی وراثت کا دعویٰ کافی تھا۔

اکبر نے سلطنت کی تقسیم کو ختم کر دیا، اور تمام اختیارات اپنی ذات میں محدود کر دیئے۔ اس نے بادشاہ کا درجہ رعایا کے لئے بطور باپ کر دیا، کہ وہ سربراہ ہے اور رعایا اس کا خاندان ہے کہ جس کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری اس پر ہے۔

اکبر، بادشاہ کی حیثیت سے اس لئے طاقت ور ہوتا گیا کیونکہ اس نے فتوحات کے ذریعہ اپنی سلطنت کو برابر پھیلایا۔ ہر فتح کے بعد نئے علاقے مغل امپائر کا حصہ بن جاتے تھے اور اس کے ذرائع بھی اکبر کو مل جاتے تھے۔ اس کی رعایا میں بھی اضافہ ہو جاتا تھا، ان حالات میں اس نے ایک ایسی بادشاہت کو قائم کیا کہ جو ہندوستان کے حالات کے مطابق ہو۔ چونکہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے وہ خود کو تمام مذہبی تعصبات سے پاک سمجھتا تھا، اس لئے اس نے ایسی اصلاحات کیں کہ جن کا اب تک تعلق ریاست سے نہیں بلکہ برادری سے تھا، جیسے اس نے بچپن کی شادی، جبریہ شادی، قریبی رشتہ داروں

میں شادی اور ستی کو بند کرادیا۔

چونکہ اکبر کا درجہ رعایا کے لئے باپ کی طرح تھا، اس لئے ہندو اسے محبت سے ''مہابلی'' (بڑا۔ طاقت والا) کہا کرتے تھے۔

ابوالفضل اور مغل نظریہء بادشاہت

ابوالفضل (وفات 1602) اکبر کے دربار کا مورخ تھا، اس نے ''اکبر نامہ'' میں اکبر اور مغل دور کی تاریخ لکھی ہے، اس کا ایک حصہ ''آئین اکبری'' ہے، جس میں اکبر کی حکومت اور اس کے انتظام کے بارے میں تفصیل دی گئی ہے۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نظریہء بادشاہت پر لکھتا ہے کہ:

> بادشاہت کا مرتبہ سب سے بڑا ہے اور خدا کے لئے سب سے زیادہ اہم ذات بادشاہ کی ہوتی ہے، کیونکہ ایک بادشاہ کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ بے ایمانوں اور باغیوں کو سزا دے اور لوگوں کو سیدھی راہ پر چلائے۔ اگر اس دنیا میں بادشاہ نہ ہوتے تو، ظالم اور بے ایمان لوگ فتنہ وفساد پھیلائے رکھتے۔

ابوالفضل کے نزدیک ایک حق پرست بادشاہ اس لئے حکومت کرتا ہے تا کہ وہ نیکی کو پھیلائے، اور جہاں خراب روایات، اور رسم ورواج ہوں انہیں ختم کر دے۔ چونکہ بادشاہ کو خدا سے روشنی اور ہدایت ملتی ہے، اس لئے اسے تمام معاملات میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ لہٰذا ابوالفضل اکبر کو ایک ایسا بادشاہ سمجھتا ہے کہ جو خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ برابر کا سلوک کرے، اس میں نہ ہندو، نہ مسلمان، اور بدھ مت کے ماننے والوں کا فرق ہو۔ اس نظریہ میں سب مذہب کے ماننے والے ایک ہوگئے۔

ابوالفضل اکبر کے دربار میں

صلح کل

نظریہء بادشاہت سے ملا ہوا، اکبر کا صلح کل کا رویہ تھا۔ اس کی بنیاد اس پر تھی کہ سماج سے مذہبی تعصبات اور نفرتوں کو ختم کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے 1563 میں ہندوؤں پر متھرا کے مقدس مقامات کی زیارت پر جو ٹیکس تھے وہ ختم کر دیئے۔ 1564 میں اس نے جزیہ کو بھی ختم کر دیا۔ اس نے ہندوؤں کے ساتھ اپنے سے پہلے حکمرانوں کی اس پالیسی کو بھی بدلا کہ انہیں اونچے عہدوں پر فائز نہ کیا جائے۔ اس لئے اب انہیں حکومت کے اعلیٰ عہدے دیئے تاکہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلمانوں کے برابر سمجھیں، اور ان میں یہ احساس ہو کہ یہ حکومت ان کی بھی ہے۔ راجہ ٹوڈرمل کو دیوان کا عہدہ دیا گیا، جو مغل حکومت کا سب سے اہم عہدہ ہوا کرتا تھا۔ بھگوان داس اور مان سنگھ دونوں کو اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ راجہ بیربل اکبر کا قریبی دوست تھا۔

اکبر نے دوسرا کام یہ کیا کہ ہندو مذہب کو سمجھنے کی خاطر ان کی مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ ہندوؤں کے تہوار، دسہرہ، دیوالی، اور ہولی دربار میں منائے جانے لگے۔ اس نے گائے کی قربانی بھی بند کر دی۔

صلح کل پالیسی کا اہم حصہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کا احترام کرنا چاہئے۔ ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ اپنے مذہب پر قائم رہے اور دوسروں کو برا نہیں سمجھے۔

ابوالفضل کا مذہب کے بارے میں بیان

ان لوگوں کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ جو اپنے مذہبی اصولوں پر چلتے ہیں۔
اگر ان میں اور تمہارے اصولوں میں فرق ہے تو اسے برداشت کرنا چاہئے۔
ہر فرد چاہے اس کا مذہب اور عقیدہ کچھ بھی ہو، وہ نعمت اور رحم سے محروم نہیں رہے۔
اس دنیا کو ایسا باغ بنانا چاہئے جہاں امن و محبت بھرے پھولوں کی خوشبو ہو۔

منصب داری نظام

اکبر نے اپنی تخت نشینی کے گیارہویں سال (1564) میں منصب داری کا نظام شروع کیا۔ بادشاہت کے ادارے کے لئے ایک ایسی جماعت یا گروہ کی حمایت یا وفاداری کی ضرورت ہوتی تھی کہ جو اس کی مضبوطی کے لئے کام کرے۔

مغلوں کے ہم عصر ایرانی اور عثمانی حکمران خاندان اس مقصد کے لئے غلاموں کو تربیت دے کر ان پر اعتماد کرتے تھے۔ اکبر نے غلامی کے ادارے کو قائم نہیں کیا، بلکہ اس کی جگہ منصب داری کا نظام شروع کیا۔ اس نظام میں تمام منصب دار چاہے ان کا تعلق کسی مذہب اور ذات سے ہو، وہ ایک طبقہ کے طور پر متحد ہو کر بادشاہ کے وفادار ہو گئے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مغل شہزادے جو اب تک علیحدہ ایک طبقہ تھے، انہیں بھی منصب داری نظام میں شامل کر کے اس کا حصہ بنا دیا۔ اب وہ بادشاہ کے ملازم ہو گئے، اس طرح ان میں اور دوسرے منصب داروں میں زیادہ فرق نہیں رہا۔

یہ منصب دار بادشاہ کے لئے فوج رکھتے تھے، ان کی اپنی علیحدہ سے کوئی فوج نہیں ہوتی تھی، اس لئے ان کی جانب سے بغاوت کے خطرات بھی کم ہو گئے اور بادشاہ کی پوزیشن مضبوط ہو گئی۔ منصب دار کی حیثیت سے اب وہ ان تمام قوانین کے پابند تھے جو بادشاہ کی جانب سے نافذ ہوئے تھے، یعنی گھوڑوں کو داغ لگوانا، تا کہ جعلی گھوڑے پیش نہیں کئے جائیں، فوجیوں کا معائنہ کرنا، ان کے ذمہ جتنی فوج ہے اسے رکھنا، اگر وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرتے تھے تو انہیں جرمانہ دینا ہوتا تھا۔

اکبر نے اپنے منصب داروں کو اس قدر مراعات دیں تھیں کہ وہ بادشاہوں کی طرح رہتے تھے۔ انہیں جو دولت، شان و شوکت، اور عزت ملی ہوئی تھی، یہ انہیں بادشاہ سے وفادار رہنے پر مجبور کرتی تھیں۔ اکبر اپنے منصب داروں کی عزت کرتا تھا، اگر وہ اس کی باتوں کی مخالفت کرتے تو اس پر ناراض نہیں ہوتا تھا۔ منصب داری نظام نے تمام مغل امراء کو ایک سلسلہ میں جوڑ دیا۔ اکبر اس نظام کے تحت چاہتا تھا کہ تمام جماعتیں اس کی وفادار ہوں، تا کہ وہ کسی ایک گروپ کی مدد کا محتاج نہیں رہے۔

اکبر بادشاہ

چار اہم وزراء

مغل حکومت کے چار وزراء انتہائی اہم ہوتے تھے۔

1- دیوان: یہ فنانس یا مالیات کا وزیر ہوتا تھا۔
2- بخشی: یہ فوج کا انچارج ہوتا تھا۔
3- صدر الصدور: یہ مذہبی معاملات کا انچارج ہوتا تھا۔
4- خانساماں: شاہی خاندان کے گھریلو انتظامات کا انچارج تھا۔

اکبر کی مذہبی پالیسی

اکبر اپنی نوجوانی میں مذہبی تھا، خواجہ معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کرتا تھا۔ سلیم چشتی کا معتقد تھا، مگر آہستہ آہستہ اس کے خیالات میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اس کی اہم وجہ دربار کے علماء کا رویہ تھا، جس نے اکبر کو ان سے دور کر دیا۔ خاص طور سے دربار کے دو علماء عبدالنبی اور مخدوم الملک جو ایک دوسرے سے لڑتے بھی رہتے تھے اور مذہب کے معاملات میں سخت رویہ رکھتے تھے۔ 1575 میں اکبر نے اپنے نئے کیپٹل فتح پور سیکری میں ایک عمارت "عبادت خانہ" کے نام سے تعمیر کرائی، اس کا مقصد تھا کہ یہاں علماء کو بلایا جائے اور ان سے مذہبی معاملات پر بحث و مباحثہ کیا جائے۔

اس نے یہ پروگرام بنایا کہ ہر جمعرات کو سادات مشائخ اور امراء کو دعوت دی جائے تاکہ وہ مذہبی امور پر بات چیت کریں۔ یہ لوگ علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں بیٹھتے تھے اور بادشاہ ہر جماعت کے پاس جا کر ان کے خیالات سنتا تھا۔ اگر ضرورت پڑتی تھی تو لائبریری سے کتابیں منگوا کر دلائل کی تسلی کی جاتی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ جب مذہبی معاملات پر بحث شروع ہوئی تو علماء نے ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ کہنا شروع کر دیا۔

لیکن اکبر کو ان بحثوں سے اس قدر دلچسپی ہوئی کہ اس نے کافی وقت عبادت خانہ میں گذارنا شروع کر دیا، کبھی کبھی تو وہ جمعہ کے روز پوری رات وہیں گذارتا تھا اور ذوق شوق سے بحث میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن ان بحثوں کی وجہ سے مذہب کے بارے میں اُس کے ذہن میں شکوک پیدا ہونا شروع ہو گئے۔

ابتداء میں تو صرف مسلمان علماء شریک ہوتے تھے، مگر اب اکبر نے دوسرے مذاہب کے علماء کو بھی دعوت دینی شروع کر دی، جن میں برہمن، جین مت کے مذہبی عالم، جن سے متاثر ہو کر اس نے کچھ دنوں میں گوشت کھانا بند کر دیا، زرتشت کے ماننے والے، جن کی وجہ سے اس نے محل میں ہمیشہ آگ روشن رکھنے کا حکم دیا۔

فادر مونسیراٹ اور عبادت خانہ میں بحث

اس کے بعد بحث و مباحثہ کا موقع دیا گیا۔ یہ مباحثہ رات کو ہوا، اس میں مختلف علماء اور مذہبی ماہرین موجود تھے۔ یہاں پر جو موضوعات زیر بحث آئے وہ ایسی کتابوں کی صداقت کے بارے میں تھے کہ جن پر عیسائی مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کے ان عقیدوں کے بارے میں کہ جن پر ان کا ایمان ہے۔

اس نے عیسائیوں کو بھی عبادت خانے میں آنے کی دعوت دی، اس وقت گوا میں پرتگیزیوں کی حکومت تھی، وہاں سے پہلا عیسائی مشن 1580 میں فتح پور سیکری آیا۔ اس کے ایک ممبر نے جس کا نام فادر مونسیراٹ تھا، اکبر کے دربار کے حالات پر بعد میں ایک کتاب لکھی۔

دیکھا جائے تو عبادت خانہ اور اس کی مذہبی بحثیں اکبر کا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ ان بحثوں سے ایک بات تو یہ سامنے آئی کہ ہر مذہب کے عالم نے اپنے مذہب کو سچا کہا اور دوسرے تمام مذاہب کو گمراہ کن قرار دیا۔ اس سے اکبر نے یہ سیکھا کہ بات اس کے الٹ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر مذہب میں سچائی ہے، اس لئے اس سے نفرت کی بجائے اس کی عزت کرنی چاہیے۔

بائبل کا تحفہ

فادر مونسیراٹ لکھتا ہے کہ

وہ اپنے ساتھ بائبل لے کر گئے جو کہ چار زبانوں میں لکھی ہوئی تھی اور جس کی سات جلدوں میں جلد بندی کی گئی تھی۔ بادشاہ نے اپنے امراء کی موجودگی میں نہ صرف بائبل کو بوسہ دیا بلکہ احتراماً اسے اپنے سر پر بھی رکھا۔

آئین راہنمونی

اکبر کی مذہبی پالیسی کے بارے میں اکثر اس کے "دین الٰہی" کا ذکر کیا جاتا ہے، اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے اس نے کوئی نیا مذہب جاری کیا تھا۔ حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ "دین الٰہی" کا لفظ اکبر کے بعد استعمال ہونا شروع ہوا۔ ابوالفضل اسے "آئین راہنمونی" یعنی ہدایت کے اصول کہتا ہے۔ اس کے خاص خاص اصول یہ تھے۔

1- دوسرے مذاہب کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔
2- کسی کا مذہب زبردستی تبدیل نہیں کیا جائے گا۔
3- زندہ مخلوق کو پریشان نہیں کریں گے۔
4- تقلید سے پرہیز کیا جائے گا۔
5- مذہبی رسومات سے دوری اختیار کی جائے گی۔

اکبر خود کو گرو کہتا تھا، اور جو اس کے مرید ہو گئے تھے، وہ چیلے کہلاتے تھے، اس لئے دیکھا جائے تو اس نے کوئی نیا مذہب شروع نہیں کیا تھا نہ اکبر نے کسی کو اس میں زبردستی شامل کرنے کی کوشش کی۔ ابوالفضل آئین راھنمونی کے ایک اور اصول کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"ارادت مند اشخاص آئین مقدس کے مطابق گوشت خوری سے جہاں تک ممکن ہو پرہیز کرتے ہیں۔"

راجپوت پالیسی

اکبر کی راجپوت پالیسی کا تعلق اس کی مذہبی پالیسی سے نہیں تھا۔ راجپوتوں سے اس نے اس وقت دوستی کی کہ جب وہ سخت مذہبی تھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ جب ہمایوں ایران گیا تو ایران کے بادشاہ طہماسپ نے اسے مشورہ دیا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں افغان مغلوں کے مخالف ہیں اس لئے انہیں راجپوتوں سے تعلقات بڑھانا چاہئیں۔ ہمایوں تو اس پر عمل نہیں کر سکا، مگر جب 1562 میں اکبر کو راجہ بھارمل کچھواہہ کی جانب سے یہ پیغام ملا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنا چاہتا ہے تو اکبر نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ اس شادی کی خاص بات یہ ہے کہ اس نے راجپوت شہزادی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا، وہ ہندو مذہب کے مطابق عبادت بھی کرتی تھی اور ہندو رسم و رواج کو بھی جاری کئے رہی۔

ایک مورخ نے راجپوتوں اور مغلوں کی دوستی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اس لئے مغل بادشاہ کے وفادار ہو گئے کیونکہ وہ خود کو "راجہ کے بیٹے" کہتے تھے، مگر ان کے ہاں یہ راجہ غائب تھا، مغل بادشاہ نے اس راجہ کی جگہ لے لی، اور یوں انہوں نے اپنی ذات کو مکمل کر لیا۔ مغلوں نے ان کی وفاداری کے بدلے میں انہیں عہدے، منصب، دولت، عزت اور عظمت دی۔ ان کی رسومات و رواج کو اسی طرح سے رہنے دیا۔

راجپوتوں نے مغلوں کے ساتھ اس لئے بھی شادی بیاہ کے سلسلہ میں تعصب کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ان کا قبائلی نظام تھا برہمنوں کی طرح ذات پات کی سختی نہیں تھی۔ دوسری مغلوں سے شادی برابری کی بنیاد پر ہوئی، کسی شکست کے نتیجہ میں نہیں ہوئی۔ جب یہ مغلوں کے رشتہ دار ہو گئے تو اکبر نے ان کے ساتھ گھر والوں جیسا سلوک کیا، انہیں دوسرے منصب داروں کے مقابلہ میں زیادہ مراعات تھیں۔ ایک تو انہیں ریاست کی جانب سے جاگیر ملتی تھی، دوسرے ان کے علاقے کی جاگیر جو "وطن جاگیر" کہلاتی تھی اس کی آمدنی بھی ان کے پاس ہوتی تھی۔ اکبر اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ انہیں راجپوتانہ میں جنگ کے لئے نہیں بھیجتا تھا بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں یہ لڑنے جاتے تھے۔

مغلوں کی ملازمت میں آنے کے بعد راجپوتوں نے ان صلاحیتوں کو جو آپس کی لڑائیوں میں صرف ہوتی تھیں، انہیں مغل امپائر کو بنانے میں صرف کیا اور یوں انہوں نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا۔ اس نے مغل بادشاہت اور ریاست

کوقومی ریاست بنادیا۔

اکبر کے دور کے سونے اور چاندی کے سکے

جاگیرداری

مغل حکمراں اپنے امراء کو تنخواہ کے عوض جاگیریں دیتے تھے، مگر یہ موروثی نہیں ہوتی تھیں، نہ ہی یہ جاگیریں ایک علاقہ میں رہتی تھیں، ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا تاکہ وہ کسی ایک جگہ رہ کر اپنے اثر ورسوخ کو نہ بڑھا سکیں۔ ان کے مرنے پر جاگیر واپس مغل ریاست کے پاس آ جاتی تھی۔ زمینداری یا جاگیرداری یہ اصطلاح ہندوستان میں مغلوں کے زمانہ

جاگیرداروں کے بارے میں برنیر کا بیان

ایک فرانسیسی سیاح برنیر جو ہندوستان آیا، اس نے اپنے سفرنامہ میں جاگیردارانہ نظام کے بارے میں لکھا ہے کہ:

ایک طرف تو کاشت کار اپنے دل میں ہمیشہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کیا ہم اس لئے محنت کریں کہ کوئی ظالم آئے اور سب کچھ چھین لے جائے اور چاہے تو ہماری بسر اوقات کے لئے بھی ہمارے پاس کچھ نہ چھوڑے اور دوسری طرف جاگیردار اور صوبہ دار یہ سوچتے ہیں کہ کیوں چھوڑی ہوئی اور ویران زمین کی فکر کریں، اپنا روپیہ اور وقت کو بارآور بنانے میں لگائیں کیونکہ نامعلوم کس وقت یہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور ہماری محنت اور کوشش کا پھل نہ ہم کو حاصل ہو نہ ہماری اولاد کو۔ پس زمین سے جو کچھ وصول ہو سکے کرلیں، ہماری بلا سے کاشت کار بھوکے مریں یا اجڑ جائیں۔

میں استعمال ہونی شروع ہوئی، ورنہ اس سے پہلے ان کو رئیس، راجہ، اور ٹھاکر کہا جاتا تھا۔ سلطنت کے عہد میں یہ اقطاع دار کہلاتے تھے۔

جاگیر کی کئی قسمیں ہوتی تھیں: خالصہ جاگیر بادشاہ کے لئے ہوتی تھی، جس کی آمدنی سے اس کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ ''پائے باقی'' وہ زمین ہوتی تھی کہ جسے علیحدہ سے رکھا جاتا تھا تا کہ نئے منصب دار کو دی جا سکے۔ ''زور طلب'' وہ زمین ہوتی تھی کہ جہاں بغاوت یا شورش کی وجہ سے لگان حاصل کرنا مشکل ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ ''اوسط آمدنی کی زمین'' اور ''سیر حاصل زمین'' کا فرق بھی تھا۔ اورنگ زیب کے آتے آتے سیر حاصل زمین حاصل کرنے والے امیدوار زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ لوگ سفارش اور رشوت سے یہ زمینیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چھوٹے جاگیرداروں کو بنجر یا زور طلب زمینیں ملتی تھیں۔

اکبر جاگیرداری کے نظام کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے ساری زمینوں کو خالصہ قرار دیدیا اور منصب داروں کی نقد تنخواہیں مقرر کر دیں۔ لیکن نقد تنخواہ دینا مشکل ہو گیا، کیونکہ جو منصب دار دور دراز کے علاقوں میں تھے انہیں بروقت ادائیگی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اکبر نے نقد تنخواہ اور جاگیر تنخواہ کے عوض ان دونوں کو باقی رکھا۔

اکبر کی شخصیت

اکبر کی شخصیت کے بہت پہلو تھے۔ وہ صرف ہندوستان کا بادشاہ ہی نہیں تھا، بلکہ خود کو ایک عام انسان بھی سمجھتا تھا۔ وہ دربار سے اٹھ کر کاریگروں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرتا تھا، بھیس بدل کر عام لوگوں میں گھومتا پھرتا تھا، دوستوں اور مصاحبوں کے ساتھ بے تکلف ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت کے اس پہلو پر بہت سے غیر ملکی سفیروں اور سیاحوں نے لکھا ہے۔ رفیع الدین شیرازی، ایک ایرانی سوداگر تھا جو 64-1560 میں ہندوستان آیا تھا، اس نے اکبر کو جس طرح دیکھا اس کے بارے میں دلچسپ باتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ لکھتا ہے کہ:

اکبر اور کسان

ایک اور موقع پر وہ شکار کا تعاقب کرتے ہوئے ایک ایسے گاؤں میں پہنچ گیا کہ جہاں کے لوگ باغیانہ طبیعت کے تھے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت (اکبر) کو پکڑ لیا اور پوچھا:

> ''تم کون ہو؟'' اعلیٰ حضرت نے جواب دیا ''میں خان خاناں (بیرم خاں) کا نوکر ہوں۔'' ان لوگوں نے شرارتاً اعلیٰ حضرت کو مویشیوں کے باڑے میں بند

کر دیا۔ پڑاؤ نہ پہنچنے پر اعلیٰ حضرت کی تلاش ہوئی اور سپاہی اس گاؤں میں بھی پہنچے (معلوم ہونے پر) پیر محمد شروانی نے لشکر کے ساتھ آ کر گاؤں کو گھیرے میں لے لیا، تب کہیں جا کر اعلیٰ حضرت کو چھڑایا جا سکا۔

اس کے بعد ایک اور دفعہ وہ شکار کے پیچھے بھوکے پیاسے ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ اس گاؤں میں بھٹیار خانہ تھا، اعلیٰ حضرت کھانا کھا کر آرام کرنے لگے۔ جب اعلیٰ حضرت آرام فرما رہے تھے تب کچھ اور مسافر اس سرائے میں آ گئے اور انہیں ایک غریب اور مفلس مسافر سمجھ کر ان سے سلام کے خواہاں ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، تو ان لوگوں کو بہت برا لگا اور غصہ میں دو چار چابک رسید کر کے انہیں وہاں سے بھاگ جانے کو کہا۔ اعلیٰ حضرت چونکہ اکیلے تھے اس لئے انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر کے خاموشی سے اپنی راہ لی۔ بعد میں بھٹیاری نے ان لوگوں سے کہا کہ انہوں نے بہت غلط حرکت کی۔ یہ تو اکبر بادشاہ تھے، جو شکار کھیلتے ہوئے اپنے پڑاؤ سے دور نکل آنے کی وجہ سے یہاں آ پہنچے۔ یہ معلوم ہونے پر وہ مسافر بہت شرمندہ ہوئے اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک مرتبہ تو خود میں نے اسے اپنے محل کی چھت پر پتنگ اڑاتے دیکھا۔ وہ ننگے سر تھا اور صرف ایک لنگی پہنے ہوئے تھا۔

(بحوالہ شیریں موسوی: شہنشاہ اکبر)

اکبر کی وفات

اکبر کی وفات پر ہندوستان میں جو لوگوں کے تاثرات تھے، اس کے بارے میں بنارسی داس (پیدائش 1586) نے لکھا ہے۔ یہ آگرہ کا ایک تاجر تھا، یہ خیالات اس کی "آپ بیتی" سے لئے گئے ہیں۔

پورا شہر خوف زدہ تھا۔ ہر شخص نے گھبراہٹ میں اپنے گھر کے دروازے بند کر لئے۔ دکانداروں نے اپنی دکانیں بڑھا دیں۔ پریشانی کے عالم میں مال دار لوگوں نے اپنے جواہرات اور دوسرا تمام قیمتی سامان چھپا دیا۔ کچھ نے اپنی تمام

دولت اور نقدی گاڑیوں میں بھری اور محفوظ اور الگ تھلگ جگہوں پر چھپا آئے۔
گھر گھر لوگوں نے ہتھیار جمع کرنے شروع کر دیئے۔ امیر لوگ اپنی شناخت چھپانے کے لئے غریبوں کی طرح موٹے چھوٹے کپڑے پہننے لگے...... ہر طرف خوف و ہراس کا عالم تھا، جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ کوئی چور ڈاکو نہ تھے۔
یہ افراتفری اس وقت ختم ہوئی جب دس روز کے بعد آگرہ سے ایک خط آیا کہ دارالحکومت میں سب خیریت ہے۔ صورت حال معمول پر آ گئی۔
(بحوالہ شیریں موسوی)

شہنشاہ اکبر کا مقبرہ
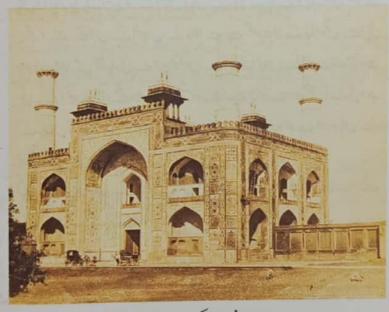
ساتواں باب

شاہی علامات اور دربار

بادشاہت کے نظام میں حکمراں خود کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنے کے لئے ایسی علامات کو اختیار کرتے ہیں کہ جن سے ان کی شان اور بڑائی ظاہر ہو۔ ان کے لئے یہ اس لئے ضروری ہوتا ہے تا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی طاقت اور دولت کا رعب بیٹھ جائے اور وہ ان کے وفادار اور تابع رہیں۔ مغل بادشاہوں نے بھی، اس طرح کی خاص علامات اپنے لئے اختیار کر رکھی تھیں کہ جن کی بنیاد پر ان کی حکومت کو تسلیم کیا جاتا تھا، اور لوگوں کو برابر یہ احساس دلایا جاتا تھا کہ وہ ان کے بادشاہ اور سربراہ ہیں۔

ایک تو مغل بادشاہ، اپنی بادشاہت کو ''موروثی'' سمجھتے تھے اور اپنا تعلق اپنے جد امجد تیمور (1405-1370) سے ملاتے تھے۔ دوسرے چونکہ ان کے خاندان کی شادیاں چنگیز خاں کے خاندان میں ہوئیں تھیں، اس لئے یہ اس پر بھی فخر کرتے تھے۔ مغل بادشاہ بار بار ''تورۂ چنگیزی'' یا چنگیزی قوانین کا ذکر کرتے ہیں، جن پر وہ وقتاً فوقتاً عمل بھی کرتے تھے۔

تخت

مغلوں کی شاہی علامات میں سب سے اہم تخت ہوتا تھا۔ اکثر ہم ''تخت و تاج'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، مگر مغل بادشاہ تاج نہیں پہنتے تھے اس کی جگہ وہ پگڑی باندھتے تھے جس پر ہیرا، یا قیمتی پتھر آویزاں ہوتا تھا۔ تخت پر بیٹھنے کا مطلب تھا کہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ اس لئے جب کوئی بادشاہ بنتا تھا تو سب سے پہلے ''رسم تخت نشینی'' ہوتی تھی کہ جس میں نیا بادشاہ دربار میں سب کے سامنے تخت پر بیٹھتا تھا، اس موقع پر وہ امراء اور درباریوں کو تحفے تحائف بھی دیتا تھا، اور انہیں انعامات سے بھی نوازتا تھا۔

دربار میں بادشاہ چاہے وہ دربار عام ہو یا دربار خاص ہمیشہ تخت پر بیٹھتا تھا، جب کہ درباری اس کے سامنے دو

قطاروں میں باادب کھڑے ہوتے تھے۔ مغل بادشاہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق تخت بنواتے رہتے تھے۔ مثلاً شاہ جہاں نے خاص طور سے تخت طاؤس بنوایا تھا۔

جہانگیر تخت سے اٹھ کر شاہ جہان کا استقبال کرتے ہوئے

تخت طاؤس کے بارے میں فرانسیسی سیاح برنیر کا بیان

یہ تخت جو طلائی پایوں کا ہے جن کو کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں، جن میں یاقوت اور زمرد اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں...... دو مور جو موتیوں اور جواہرات سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں، بہت ہی خوب اور نہایت عمدہ نقشے پر مبنی ہیں۔

(ترجمہ: خلیفہ محمد حسین)

شاہ جہان اور تخت طاؤس

تخت رواں کے بارے میں برنیر کا بیان

اکثر اوقات بادشاہ تخت رواں پر سوار ہوتا ہے، جس کو کہار اٹھاتے ہیں، یہ تخت ایک قسم کا مکلّف چوبیں بنگلہ ہوتا ہے جس کے روغن کاری اور ملمع کے ستون اور آئینہ دار کھڑکیاں ہوتی ہیں جو تیز ہوا اور بارش وغیرہ کے وقت بند کی جاتی ہیں۔

(ترجمہ: خلیفہ محمد حسین)

خطبہ

یہ دستور تھا کہ جب نیا بادشاہ تخت نشین ہوتا تھا تو جمعہ کے خطبہ میں اس کا نام پڑھا جاتا تھا، یہ ایک طرح سے نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا اعلان ہوتا تھا۔ اس کے بعد جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں امیر تیمور سے لے کر موجودہ حکمراں کے نام خطبے میں پڑھے جاتے تھے۔

سکّہ

اکبر کے دور کے چاندی کے سکے

ہر نیا بادشاہ، تخت نشینی کے فوراً بعد اپنا سکّہ جاری کرتا تھا۔ اس کی ایک جانب اس کا نام اور خطابات ہوتے تھے، دوسری جانب اس کی تعریف میں اشعار، یا کوئی قرآنی آیت یا کلمہ ہوتا تھا۔

شاہی مہریں

شاہ جہان کے دور کے چاندی کے سکے

نیا بادشاہ، اپنی مہریں بنواتا تھا، ان پر اس کا نام اور خطابات ہوتے تھے، جب کہ مہر کے حاشیہ پر سابق حکمرانوں کے نام کندہ کرائے جاتے تھے۔ ان مہروں کو دستخط کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ انہیں تمام شاہی فرمانوں اور احکامات پر بھی لگایا جاتا تھا۔ ایک خاص شاہی مہر ہوتی تھی جو "اوزک" کہلاتی تھی۔ یہ کسی وفادار اور قابل اعتبار امیر کے پاس ہوتی تھی۔

جھنڈے

مغل حکمرانوں کے خاص جھنڈے یا عَلَم ہوا کرتے تھے۔ ان کا کوئی ایک رنگ مخصوص نہیں تھا، مگر کچھ جھنڈے صرف بادشاہ کے لئے ہوتے تھے، انہیں کوئی امیر یا شہزادہ استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ خاص طور سے جب بادشاہ جلوس کی شکل میں جاتا تھا تو کئی قسموں اور رنگوں کے جھنڈے اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان جھنڈوں پر خاص علامتیں ہوتی تھیں، جیسے پنجہ کا نشان، سورج، ترازو، اژدھا اور مچھلی وغیرہ۔

مغل حکمرانوں کے جھنڈے یا عَلَم

دوسرے امتیازات

ان علامات کے علاوہ مغل بادشاہوں نے چند باتیں صرف اپنے لئے رکھ رکھیں تھیں، اور کسی کو انہیں اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی، جیسے جھروکہ درشن، بادشاہ صبح محل کے جھروکے میں آ کر رعایا کو درشن دیا کرتا تھا، اس رسم کو اکبر نے شروع کیا تھا، جسے اس کے جانشینوں نے جاری رکھا۔ ہاتھیوں کی لڑائی بھی صرف بادشاہ کے لئے مخصوص تھی۔ شاہی محل میں نوبت خانہ ہوا کرتا تھا، جہاں دن رات کے مختلف اوقات میں نوبت بجا کرتی تھی، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں تھا کہ شاہی نوبت خانے کی موجودگی میں نوبت بجائے۔ نوبت خانے میں موسیقی کی دھنوں کے ذریعے بادشاہ کی نقل وحرکت کا اعلان کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ مسجد میں پالکی سے جانا، مسجد میں مقصورہ (علیحدہ جگہ) نماز پڑھنا اور شاہی شکار کی طرح جو قمرغہ کہلاتا تھا، دوسروں کے لئے منع تھا۔

ان مراعات اور امتیازات کی وجہ سے بادشاہ کی شخصیت دوسروں سے برتر ہو جاتی تھی۔

دربار اور اس کے آداب

مغل دربار کی حیثیت ایک ادارے کی تھی۔ یہ دستور تھا کہ بادشاہ ہر روز دربار کیا کرتا تھا جس میں تمام اہم منصب دار، عہدے دار، اور امراء شریک ہوتے تھے، یہاں سلطنت کے معاملات پر غور ہوتا تھا، اور تمام انتظامی فیصلے کئے جاتے تھے۔ اگر کسی دوسرے ملک سے سفیر آتے تھے تو وہ بھی دربار میں آ کر پیش ہوتے تھے اور بادشاہ کے سامنے اپنے حکمراں کے خطوط اور تحفے پیش کرتے تھے۔

دربار، دارالحکومت میں بھی ہوتا تھا، اگر بادشاہ دوسری جگہوں پر جاتا، یا کیمپ میں ہوتا تو وہاں بھی دربار باقاعدگی سے ہوا کرتا تھا۔ شہروں میں فتح پور سیکری، آگرہ، دہلی اور لاہور وہ مقامات تھے کہ جہاں دربار عام اور دربار خاص کی عمارتیں تھیں۔

دربار میں امراء کو اپنے درجہ اور مرتبہ کے مطابق جگہ ملتی تھی۔ دربار میں بادشاہ کے آنے، اور جانے کی اطلاع نوبت بجا کر کی جاتی تھی۔

دربار کو خاص موقع پر سجایا جاتا تھا، مثلاً نوروز پر، بادشاہ کی سالگرہ پر، تہواروں پر، اور سفیروں کی آمد پر۔

مغل بادشاہوں نے دربار کے آداب مقرر کئے تھے۔ ان آداب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ تمام درباری جو موجود ہوتے تھے، انہیں اپنی جسمانی حرکت پر پوری طرح کنٹرول کرنا ہوتا تھا، بادشاہ کی موجودگی میں بات چیت کرنا، ہنسنا،

کھانسنا، جسم کو کھجلانا، اور بلا وجہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا سخت بے ادبی ہوا کرتی تھی۔ آداب کی رسومات اس لئے بھی ضروری تھیں تا کہ ان کے ذریعہ بادشاہ کی بڑائی اور برتری قائم رہے۔ ان آداب میں ایک ''کورنش'' تھی، اس میں سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کو پیشانی پر رکھ کر سر جھکاتے تھے۔ دوسرا طریقہ ''تسلیم'' تھا، اس میں سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی کو سر پر رکھتے تھے۔ ان دونوں کے ذریعے درباری اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ ان آداب کے علاوہ ''قدم بوسی'' یا ''سجدہ'' کا بھی دستور تھا۔

جو امراء دربار میں آتے تھے، ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ بادشاہ کو کچھ نہ کچھ بطور ''نذر'' پیش کریں۔ خاص طور سے وہ منصب دار جو دوسرے صوبوں سے آتے تھے وہ اپنے ہمراہ تحفے تحائف لاتے تھے۔ بادشاہ منصب داروں سے خوش ہو کر انہیں بھی تحفے، تحائف، نقد رقم، خطاب، اور خلعت دیا کرتا تھا۔ خلعت دینے کا مطلب تھا کہ بادشاہ خاص طور سے اپنے امیر کی خدمات کا اعتراف کر رہا ہے۔

تقریبات اور شاہی جلوس

دربار میں تقریبات اور تفریحات کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ اس کے دو مقاصد تھے: اول یہ کہ بادشاہ اس ذریعہ سے اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرتا تھا، اپنی دولت سے رعایا کو متاثر کرتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ اور اس کے خاندان کے درباری، اور امراء ان موقعوں پر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ان تقریبات میں شریک ہو کر لطف اندوز ہوتے تھے۔

مغل حکمرانوں نے وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہواروں کو بھی اسی طرح شان و شوکت سے منانا شروع کر دیا تھا، جیسے وہ مسلمانوں کے تہواروں کو مناتے تھے۔ ان تہواروں کے موقع پر محل کی خواتین خاص طور سے سرگرم ہو جاتی تھیں۔ درباری بادشاہ کو نذر دیتے تھے، جبکہ بادشاہ انہیں تحفے دیتا تھا۔ ان تہواروں میں سب سے زیادہ رنگین تہوار نوروز کا تھا۔

مغلوں کے زمانے میں شادی کی تقریبات کے موقع پر بارات کا منظر

جشن نوروز

یہ ایک قدیم ایرانی تہوار تھا، جو (انگریزی مہینہ مارچ) ایرانی سال کے پہلے مہینہ میں بہار کے موسم کے شروع ہونے پر منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر محل کو سجایا جاتا تھا، شہر میں مکانات اور بازاروں کو بھی مختلف رنگوں سے رنگا جاتا تھا۔ امراء ہر روز بادشاہ کی دعوت کرتے تھے، اور جس امیر کے گھر بادشاہ چلا جاتا تھا، وہ اس کے لئے فخر کی بات ہوتی تھی۔

نوروز کے موقع پر ''مینا بازار'' لگا کرتا تھا۔ بازار میں امراء اپنے اسٹال لگاتے تھے جہاں قیمتی اور انوکھی اشیاء رکھی جاتی تھیں۔ خواتین اور امراء کی بیگمات کے لئے علیحدہ سے بازار ہوا کرتا تھا، جہاں تمام دکاندار اور خریدار عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ کسی مرد کو اس بازار میں آنے کی اجازت نہیں تھی، صرف بادشاہ آسکتا تھا۔

مینا بازار کے بارے میں برنیر کا بیان

اس میلہ کا بڑا لطف یہ ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسہ کے لئے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیگم صاحب بہت گراں فروش ہیں۔ دوسری جگہ سے اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے، ہم ایک کوڑی بھی زیادہ نہ دیں گے۔ ادھر وہ کوشش کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو بیچے اور جب دیکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو اکثر ایسی بڑھ جاتی ہے کہ یہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اپنے برف بیچنے کی خبر لیں، ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں اور یہ آپ کے لائق نہیں ہیں، بہتر ہے کسی اور جگہ تلاش کریں...... آخر کار سودا طے ہو جاتا ہے۔

(ترجمہ: خلیفہ محمد حسین)

جشن وزن

جشن وزن جسے تولدان بھی کہتے تھے، مغل بادشاہ اس تقریب کو سال میں دو مرتبہ مناتے تھے، یعنی اپنی شمسی اور قمری سالگرہ پر۔ اس موقع پر ایک بڑی ترازو میں بادشاہ قیمتی چیزوں اور اناج میں تلا کرتا تھا، اور یہ بعد میں غریبوں میں بانٹ دی جاتی تھیں۔

ہاتھیوں کی لڑائی

مغل بادشاہوں کو ہاتھیوں کی لڑائی کا بڑا شوق تھا۔ یہ صرف بادشاہ کا حق تھا اور دوسروں کو اس قسم کی لڑائی کرانے کا اختیار نہیں تھا۔ یہ لڑائی اکثر دارالحکومت میں جھروکہ کے سامنے والے میدان میں ہوتی تھی۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، جب بادشاہ چاہتا تھا، اسی وقت اس کا انتظام ہو جایا کرتا تھا۔

ہاتھیوں کی لڑائی

دوسری تفریحات

ان تفریحوں میں شکار کھیلنا، اور چوگان یا پولو کھیلنا بھی شامل تھا۔ مغل بادشاہوں کی یہ بھی عادت تھی کہ دربار میں کام کے دوران تھوڑا سا وقفہ کر کے موسیقی یا ناچ سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ دربار میں شعراء بھی ہوا کرتے تھے جو بادشاہ کو اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ اس کے علاوہ پہلوانوں کی کشتی، شعبدہ بازوں اور نٹوں کے کرتب اور کبوتر بازی، بھی تفریح کے ذریعے تھے۔ تہواروں میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے ساتھ ساتھ دیوالی، ہولی اور دسہرہ کی تقریبات بھی منائی جاتی تھیں۔

شاہی سواری

بادشاہوں کے لئے جلوس ضروری ہوا کرتے تھے، کیونکہ ان جلوسوں کے ذریعہ وہ نہ صرف اپنی دولت اور شان کو لوگوں پر ظاہر کرتے تھے بلکہ اپنی فوجی قوت اور طاقت کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔ اس لئے لوگ اس جلوس کو دیکھنے کے لئے دور دراز سے آتے تھے اور اپنے بادشاہ کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے۔

بادشاہ جب کبھی بھی محل سے باہر جاتا تھا تو اس کے ساتھ، جھنڈے، اسلحہ، نوبت، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور دربار کے امراء سب ساتھ ہوا کرتے تھے۔ یہ شاہی جلوس عیدین، جمعہ کے دن، یا ان موقعوں پر نکالے جاتے تھے کہ جب بادشاہ کسی مہم سے واپس آتا تھا۔ اس موقع پر بادشاہ ہاتھی پر ہودے میں رکھے تخت پر سوار ہوتا تھا، اس کے سر پر چتر یا چھتری کا سایہ ہوتا تھا، وہ گذرتے ہوئے راستہ میں لوگوں میں پیسے بانٹتا ہوا جاتا تھا۔

شاہ جہان خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری کے لئے جاتے ہوئے

ایک یورپی سیاح پیٹر منڈی کا بیان

اس سیاح نے 1631 میں شاہجہاں کے ایک جلوس کو دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ

"سب سے پہلے بیس کے قریب شاہی سواریاں تھیں، جن میں تخت رواں، پالکیاں اور دوسری سواریاں شامل تھیں۔ اس کے بعد ہزار سواروں کا ایک دستہ تھا جو ایک دوسرے سے بالکل ملے ہوئے چل رہے تھے۔ اس کے بعد بیس یا انیس ہاتھی تھے جو انتہائی قیمتی مخمل اور دوسرے ساز و سامان سے مزین تھے...... اس کے بعد نقیب تھے، جن کے ہاتھوں میں سنہری گرز تھے جن کی مدد سے یہ جلوس کو کنٹرول کر رہے تھے۔

مغل کیمپ

مغل بادشاہوں کو محلات سے زیادہ کیمپوں میں رہنا پسند تھا۔ اس لئے جب بھی وہ کسی مہم پر جاتے یا تفریح کی غرض سے کشمیر کا دورہ کرتے، شکار کے لئے باہر نکلتے تو ان کا پورا کیمپ ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ کافی دیر کیمپ میں رہتے تھے، اس لئے ان کے ساتھ پورا دربار چلا کرتا تھا، کھانے پینے کی اشیاء، سواریاں، دفاتر، اور امراء اوران کے ملازم و خیمے، اس لئے یہ کیمپ ایک طرح سے حرکت کرتے ہوئے شہر ہوتے تھے کہ جن میں بادشاہ و امراء کے علاوہ عام فوجی اور لوگ بھی ہوتے تھے، اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بازار بھی ہوتے تھے۔ کیمپ میں بادشاہ کے روزمرہ کے معمولات وہی ہوتے تھے جو وہ محل میں رہ کر کرتا تھا۔

مغل کیمپ

شاہی کیمپ کے انتظام کے لئے ایک بڑا اسٹاف ہوتا تھا۔ اس کا انچارج ''میر منزل'' کہلاتا تھا۔ وہ کیمپ کے لئے جگہ کا انتخاب کرتا تھا۔ اس کے بعد وہاں خیمے لگائے جاتے تھے۔ شاہی خواتین کے لئے علیحدہ خیمے لگائے جاتے تھے، ان کے گرد مسلح عورتیں پہرہ دیا کرتی تھیں۔

شاہی خیمہ کے سامنے ایک اونچے بانس پر شمع جلتی رہتی تھی جو ''آکاس دیا'' کہلاتی تھی، اس سے شاہی خیمہ کا پتہ چلتا تھا، اس سے ان لوگوں کی راہنمائی بھی ہوتی تھی کہ جو راستہ بھول جاتے تھے۔ ایسے لوگ اس شمع کے نیچے رات بسر کرتے تھے۔

کیمپ میں کئی بازار ہوتے تھے کہ جہاں ہر قسم کی چیزیں ملتی تھیں۔ ملکی اور غیر ملکی تاجر بھی کیمپ میں ہوا کرتے تھے، ان

میں کپڑے، دواؤں والے، اناج فروخت کرنے والے، حلوائی، پھل اور پھول بیچنے والے، اور بڑھئی، قصائی، اور کتابوں کے تاجر بھی ہوا کرتے تھے۔ بازاروں میں قیمتوں کو کنٹرول کرنے کے لئے داروغہ ہوا کرتا تھا۔

کیمپ میں لوگوں کی تفریح کے لئے قصے کہانیاں سنانے والے، گانے والے، ناچنے والے، اور کرتب دکھانے والے بھی ہوتے تھے۔ ایک یورپی سیاح مان رق نے شاہی کیمپ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> کھانوں کی اس متحرک شہر میں اس قدر بہتات ہے کہ قاری کو اندازہ لگانا چاہئے کہ جو کچھ شہر کے بازاروں میں دستیاب ہے وہ سب یہاں پر موجود ہے۔ اور صرف اشیاء کی بہتات ہی نہیں، بلکہ کیمپ میں گلیوں اور بازاروں کی صفائی قابل قدر چیز ہے۔"

مغل خزانہ

مغلوں نے جب ہندوستان میں ایک بڑی امپائر قائم کر لی تو ان کے ذرائع آمدنی بھی بڑھ گئے۔ آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تو زمین سے وصول ہونے والا لگان یا مالیہ تھا، اس کے علاوہ مختلف قسم کے ٹیکس تھے۔ جب کسی نئے علاقے پر قبضہ کیا جاتا تھا تو اس کا مال و دولت خزانہ میں جمع ہو جاتا تھا۔ امراء اور غیر ملکی سفیر تحفے تحائف دیتے تھے، وہ بھی خزانہ کا حصہ ہو جاتے تھے۔ مغل بادشاہوں کو قیمتی ہیرے جواہرات جمع کرنے کا شوق تھا اور یہ بادشاہ کا حق تھا کہ صرف وہ قیمتی ہیرے جواہرات اپنی ملکیت میں رکھے۔ شاہی ہیرے جواہرات کا علیحدہ شعبہ ہوا کرتا تھا۔ جہاں گیر خاص طور سے ان

مغل خزانہ کے بارے میں ٹاورنیر کا بیان

ایک یورپی سیاح ٹاورنیر جو عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آیا، اسے شاہی خزانہ دیکھنے کا موقع ملا، وہ اس کی تفصیل اس طرح لکھتا ہے:

"عاقل خاں نے جو کہ شاہی خزانہ کا انچارج تھا، جب ہمیں آتا دیکھا تو چار خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ وہ ہمارے ملاحظہ کے لئے جواہرات لائیں۔ یہ جواہرات لکڑی کی دو کشتیوں میں لائے گئے جن پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے اور ان پر کپڑا ڈھکا ہوا تھا...... جب ان کشتیوں سے کپڑا اہٹایا گیا تو تمام ہیروں کو تین مرتبہ گنا گیا۔ تین محرروں نے ان کی فوراً فہرست تیار کی۔...... یہ تمام پتھر بہترین پانی کے ساتھ تھے، بہت صاف اور خوبصورت شکل میں، اتنے خوبصورت کہ ان کا پانا مشکل ہوتا ہے۔"

تمام ہیروں اور جواہرات کی تفصیل لکھتا تھا جو مغل امراء اسے پیش کیا کرتے تھے۔

ان ہیروں، جواہرات اور قیمتی موتیوں کا اظہار مغل بادشاہ اس طرح کرتے تھے کہ وہ انہیں بطور زیور اور سنگھار کے پہنا کرتے تھے۔اس کے علاوہ انہیں اپنے ہتھیاروں، پگڑیوں،اور تخت میں بھی استعمال کرتے تھے۔

مغل کتب خانہ

تقریباً تمام مغل بادشاہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ بابر اور جہاں گیر نے تو اپنی یادداشتیں بھی لکھیں، کچھ شعر وشاعری کرتے تھے،اور شعراء کی سرپرستی کرتے تھے۔انہیں کتابیں جمع کرنے، انہیں پڑھنے، یا سننے کا بھی شوق تھا، ہمایوں جب جلاوطنی میں ادھر سے ادھر پھر رہا تھا، تو اس وقت بھی اونٹوں پر اس کی کتابیں ساتھ تھیں۔اکبر کو خاص طور سے علمی وادبی و مذہبی مباحثوں کا شوق تھا، اس لئے اس نے شاہی کتب خانے کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔اور کوشش کی کہ نایاب کتابیں جمع کی جائیں۔اس وجہ سے یہ پورے ہندوستان میں بہترین حوالہ جاتی کتب خانہ ہوگیا۔

کتب خانہ سے منسلک شعبہ خوش نویسی تھا، کہ جہاں وہ لوگ ملازم تھے کہ جو خوش نویسی میں ماہر تھے۔ یہ خوش نویس کتاب کی نقل تیار کرتے تھے۔کتاب کے حاشیہ پر خوبصورت پھول پتیاں بنائی جاتی تھیں۔ جب کتابت پوری ہوجاتی تھی تو مصور خاص خاص کتابوں پر موضوع کے لحاظ سے تصویریں بناتے تھے۔اکبر ''قصہ امیر حمزہ'' کا بڑا شوقین تھا، اس لئے اس نے اس کی ساری جلدوں کو با مصور کرایا تھا، اس کی ایک ہزار سات سو تصاویر بنائی گئیں تھیں۔ دربار میں تقریباً 145 مصور تھے۔

اکبر نے ترجمہ کا علیحدہ شعبہ قائم کیا تھا جہاں ہندوستانی مذاہب، فلسفہ، تاریخ اور کلچر کی کتابیں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

مغل بادشاہوں کو تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی، اس لئے وہ دربار میں مورخ رکھتے تھے، جو مغلیہ خاندان کی تاریخ لکھتے تھے۔

شاہی باورچی خانہ

مغل بادشاہ کا باورچی خانہ ایک نظام کے تحت کام کرتا تھا کیونکہ یہ نہ صرف بادشاہ کے لئے کھانا تیار کرتا تھا بلکہ حرم کی خواتین، اور ان امراء کے لئے بھی کہ جو دربار میں موجود ہوتے تھے۔ باورچی خانے کے کئی حصے ہوتے تھے کہ جہاں کھانے اور پینے کی اشیاء تیار ہوتی تھیں، جیسے آب دار خانہ، میوہ خانہ، شربت خانہ، اور آفتابچی خانہ وغیرہ۔ کام کرنے

والوں میں باورچی خانہ کا انچارج، خزانچی، اور کھانا چکھنے والے ہوتے تھے۔

جب باورچی کھانا پکاتے تھے اپنی اپنی آستینوں کو چڑھا لیتے تھے، اور قمیص کے دامن کو سمیٹ لیتے، سر کو ڈھانپتے، منہ اور ناک پر کپڑا ڈال لیتے تھے۔

جب بادشاہ کے لئے کھانا جاتا تھا تو یہ ایک جلوس کی شکل میں ہوتا تھا۔ سب سے آخر میں کھانا محل کے عہدے دار چکھتے تھے۔ دستر خوان بچھانے سے پہلے اس جگہ گلاب کا پانی چھڑکا جاتا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ کی پسند کے مطابق کھانے کے قابوں کو رکھا جاتا تھا۔ کھانے میں تقریباً چالیس قسم کا پکا ہوا کھانا ہوتا تھا۔

بادشاہ اکثر اپنے کھانے میں شہزادوں اور امراء کو حصہ بھیجا کرتا تھا، جو ایک اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔

اکبر گنگا کا پانی پیا کرتا تھا۔ یہ پانی دریا سے برتنوں میں سر بہ سر آتا تھا، بادشاہ چاہے ملک کے کسی حصہ میں ہو، گنگا کا پانی اسے پہنچایا جاتا تھا۔

لباس

لباس انسان کی شخصیت کو ابھارتا اور خوبصورت بناتا ہے، اس لئے بادشاہ اور امراء اپنے لباس پر خاص طور پر توجہ دیتے تھے۔ مغل بادشاہوں نے نئے نئے لباس تیار کرائے تھے۔ اکبر نے خاص طور سے راجپوت حکمرانوں کے لباس کو اختیار کر لیا تھا۔ اس سلسلہ میں ''توشک خانہ'' لباسوں اور خلعتوں کے لئے تھا کیونکہ بادشاہ اپنے امراء اور سفیروں کو قیمتی خلعتیں بطور تحفہ دیا کرتا تھا۔

مغلوں کے زمانے میں عورت اور مرد کا لباس

اکبر نے ہر طبقہ کے اشخاص کے لئے ان کے عہدے اور مرتبہ کے لحاظ سے لباس مقرر کیا تھا، تاکہ اس کو دیکھ کر اس شخص کے سماجی رتبہ کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ مغل بادشاہوں کی اکثریت سفید لباس پسند کرتے تھے۔ لباس کے ساتھ مغل بادشاہ زیورات کا استعمال بھی کرتے تھے۔

شاہی حرم

مغل دور کے ابتدائی زمانہ میں، شاہی خاندان کی عورتوں کو بہت آزادی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ برابر محفلوں میں شریک ہوتی تھیں، جنگی مہمات پر جاتی تھیں، پارٹیوں اور پک نکوں میں ان کے ساتھ لطف اندوز ہوتی تھیں۔ شادی کے سلسلہ میں اپنی پسند کا اظہار کرتی تھیں، جیسے حمیدہ بانو بیگم نے ابتداء میں ہمایوں سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بابر نے ''توزک'' میں شاہی خاندان کی عورتوں کے نام لکھے ہیں۔ گلبدن بیگم نے بھی ''ہمایوں نامہ'' میں عورتوں کی سماجی سرگرمیوں کی تفصیل دی ہے۔

چونکہ مغل خواتین ہر موقع پر ساتھ ہوتی تھیں، اس لئے ایسا بھی ہوا کہ وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گئیں مثلاً بابر کی بہن خانزادہ بیگم سمرقند کے محاصرے کے وقت شیبانی خاں کے قبضہ میں آئی، اس نے خانزادہ بیگم سے شادی کر لی، مگر

شاہی حرم

جب وہ دس سال بعد شیبانی کی وفات کے بعد واپس آئی تو بابر نے اس کا بڑے احترام سے استقبال کیا۔ چوسہ جنگ میں بگا بیگم، ہمایوں کی بیوی شیر شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئی، مگر اس نے عزت و احترام سے اسے واپس بھیج دیا۔ اس قسم کی مغل تاریخ میں اور مثالیں ہیں، مگر جب یہ عورتیں واپس آتی تھیں تو ان پر بدنامی کا داغ نہیں لگتا تھا۔

لیکن اکبر کے آتے آتے عورتوں کے بارے میں مغلوں کے خیالات بدلتے چلے گئے اور ان پر ہندوستانی روایات اور رسم و رواج کا اثر آتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب شاہی خواتین کا نام نہیں لیا جاتا تھا، وہ محل کی چار دیواری میں بند کر دی گئی

تھیں۔شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے دور میں یہاں تک ہوا کہ مغل شہزادیوں کی شادیاں بھی نہیں ہوئیں، کیونکہ شادیاں صرف چچازاد بھائیوں سے ہوتی تھیں، جب ان کی تعداد کم ہوئی تو روشن آرا، جہاں آرا، اور زیب النساء وغیرہ غیر شادی شدہ رہیں۔اب بیوہ کی شادی پر بھی پابندی ہوگئی۔

حرم کے بارے میں ابوالفضل کا بیان

جہاں پناہ نے ایک بہت بڑا حصار تعمیر کر دیا ہے۔اس احاطے کے اندر آرام دہ اور دلچسپ مکانات ہیں۔اگرچہ پانچ ہزار عورتیں ان مکانوں میں رہتی ہیں، لیکن قبلہ عالم نے ہر عورت کو ایک جداگانہ کمرہ اور مکان عنایت کیا ہے......اگر امراء کی بیگمات یا دیگر باعصمت عورت حرم شاہی میں حاضر ہو کر ملنا چاہتی ہے تو یہ عورتیں پہلے حرم کے عہدے داروں کو درخواست دیتی ہیں، وہاں سے جواب ملنے پر ان کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔

(آئین اکبری)

اکبر نے حرم کے انتظامات کے لئے باقاعدہ شعبہ بنایا تھا۔اس کے عہد میں حرم کے لئے ''شبستانِ اقبال'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔دستور یہ تھا کہ محل کے دروازے شام ہوتے ہی بند کر دیئے جاتے تھے۔حرم پر عورتوں کا پہرہ ہوتا تھا، جب کے باہر راجپوت سپاہی پہرہ دیا کرتے تھے۔پردہ کی پابندیوں کی وجہ سے شاہی خواتین بہت کم محل سے جاتی تھیں۔

مغل امراء

امراء، بادشاہت کے ادارے کے اہم ستون ہوتے تھے۔اس وجہ سے بادشاہ ایسے لوگوں کو امراء کے طبقے میں شامل کرتے تھے کہ جو نہ صرف لائق ہوں بلکہ وفادار بھی ہوں۔مغل خاندان کے اہم امراء کا تعلق تورانی گروہ سے تھا جو کہ اس خاندان کے ہم وطن تھے، یہ خاص طور سے جنگ جو اور لڑنے والے تھے، دوسرا بڑا گروہ ایرانیوں کا تھا، جو کہ انتظامی عہدوں پر زیادہ تر تھے۔اس کے بعد اکبر نے راجپوتوں کو شامل کر کے ہندوستان کے لوگوں کو ان کا حصہ دیا۔راجپوتوں کے علاوہ کایستھ اور کھتری ذات کے ہندو بھی امراء میں تھے، مگر یہ لوگ انتظامی عہدوں پر تھے۔دکن کی ریاستوں کے فتح

ہونے کے بعد یہاں کی مسلمان ریاستوں کے امراء اور مرہٹہ بھی امراء کے حلقے میں آ گئے۔ چونکہ ہمایوں نے افغانوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی، اس لئے ان پر زیادہ اعتماد نہیں کیا گیا، لیکن بعد میں کچھ افغان امراء بھی دربار میں آ گئے۔

اکبر نے تمام امراء کو منصب داری نظام میں شامل کر لیا تھا۔ لہٰذا ان کے مرتبہ کا تعین اس سے ہوتا تھا کہ ان کو کتنے سوار رکھنا تھے۔ مثلاً 20 سے 400 تک سوار رکھنے والا منصب دار کہلاتا تھا، 500 سے 2500 سوار رکھنے والا امیر اور 4000 سے 7000 تک سوار رکھنے والے ''امرائے عظام'' کہلاتے تھے۔ 7000 کے بعد کا منصب صرف شہزادوں کو

مغل امراء

ملتا تھا۔

منصب داروں کو نقد تنخواہ بھی دی جاتی تھی، اور تنخواہ کے عوض جاگیر بھی، جو برابر بدلتی رہتی تھی۔ جن امراء کے خاندان دونسلوں سے زیادہ حکومت میں تھے، ایسے امراء ''خانہ زاد'' کہلاتے تھے، مغل بادشاہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ چونکہ بادشاہ اور امراء کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ تھے، اس لئے دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے

ڈچ سیاح پیلسے رٹ کا امراء کے بارے میں بیان

تعجب کی بات ہے کہ ان امراء کی لالچ اور طمع کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ان کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ دولت جمع کریں، چاہے اس میں انہیں لوگوں پر ظلم کرنا پڑے یا ناانصافی سے کام لینا پڑے۔ امراء کے ملازم بھی ظالم وجابر، لالچ وطمع سے بھرے ہوتے ہیں۔ اپنے آقاؤں کی طرح لوگوں سے پیسہ اینٹھتے ہیں۔ جب امراء یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اقتدار کی کرسی پر فائز ہیں اور ان کے مراتب بہت اونچے ہیں، تو وہ اسی طرح غرور وتکبر کا برتاؤ کرتے ہیں۔

تھے۔ مغل بادشاہ اپنے امراء کی حوصلہ افزائی کے لئے، اور خدمات کے عوض انہیں خطابات دیا کرتے تھے۔ ان کے منصب میں اضافہ کرتے تھے، انہیں قیمتی تحفے تحائف دیتے تھے، اگر وہ بغاوت کرتے تو زیادہ تر معاف کر دیتے تھے۔ مغل امراء اپنی دولت اور شان وشوکت کے لحاظ سے اس وقت دنیا کے امیر ترین لوگوں میں تھے۔ یہ عالیشان محلات میں رہتے تھے، ہزاروں خدمت گار وملازم ان کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان کا لباس، کھانا اور سواری ان کی عظمت کو ظاہر کرتا تھا۔

مغل دور میں امراء کا ملازمت سے ریٹائر ہونے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اگر وہ خود کسی وجہ سے ملازمت نہیں کرنا چاہتا تھا تو بادشاہ کو اس قسم کی درخواست دیتا تھا کہ اس کے گذارے کے لئے اسے کوئی جائیداد دیدی جائے۔ بادشاہ خود بھی کسی امیر کو بوڑھا ہونے پر ''خانہ نشین'' یا ''گوشہ نشین'' ہونے کی اجازت دیدیتا تھا اور اس کے لئے وظیفہ مقرر کر دیتا تھا۔

مغل سلطنت میں یہ دستور تھا کہ امراء کے مرنے کے بعد ان کی جائیداد سلطنت کے قرضوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں ضبط کر لی جاتی تھی۔ چونکہ اکثر امراء اپنی زندگی میں پورا حساب کتاب نہیں دیا کرتے تھے، اور جو آمدنی ہوتی تھی اسے خرچ کر دیتے تھے، اس لئے ان کے مرنے پر ان کی جائیداد کی تفصیل جمع کی جاتی تھی، اور جو ان پر واجبات ہوتے تھے، ان کے عوض اسے ضبط کر لیا جاتا تھا۔ لیکن مغل بادشاہ امراء کے وارثوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے اور باپ کے ورثہ میں سے انہیں کافی دولت دیدیا کرتے تھے۔

مغل امراء میں رشوت عام تھی، نور جہاں کا باپ غیاث الدولہ اس بات میں مشہور تھا کہ وہ بے دھڑک خوب رشوت لیتا ہے۔ یہاں تک کہ مذہبی عہدے دار بھی اس سے بری نہیں تھے۔ عالمگیر کا قاضی عبدالوہاب رشوت لینے میں مشہور تھا۔

آٹھواں باب
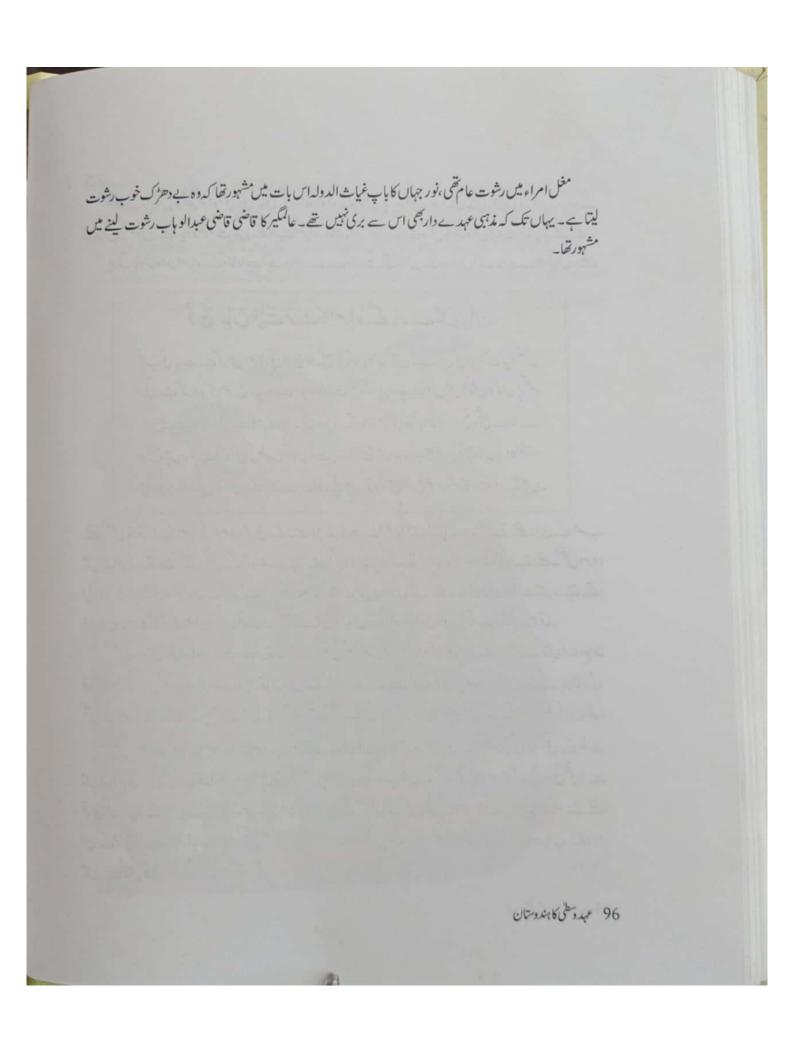
مغل سماج

مغل بادشاہوں اور امراء کی دولت کے بارے میں تاریخ میں مبالغہ آمیزی کی حد تک بیانات ہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کے ذرائع آمدنی اس قدر تھی کہ وہ دل کھول کر خرچ کرتے تھے، ان کے محلات، قلعے، باغات، بارہ دریاں، مسجدیں، اور مقبرے ان کی دولت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے خزانے میں قیمتی ہیرے، جواہرات اور موتی ہوتے تھے۔ ہر طرح سے وہ اپنی دولت کا اظہار کرتے تھے۔ مگر جہاں ایک طرف دولت کی یہ فراوانی تھی، یہ چمک دمک اور خوش حالی تھی، وہیں غربت، مفلسی، اور تنگ دستی تھی۔ ہندوستان دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، امیروں کا اور غریبوں کا۔

کسان

آبادی میں سب سے زیادہ تعداد کسانوں کی تھی جو گاؤں اور دیہاتوں میں رہتی تھی، کھیتی باڑی کرتی تھی، مگر ان کی محنت کا صلہ ان کے بجائے جاگیرداروں کو ملتا تھا، جاگیردار اپنا حصہ رکھ کر بقایا بادشاہ کے خزانے میں جمع کراتے تھے۔ اگر خشک سالی ہو جائے، یا قحط پڑ جائے اور کسان مالیہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو، تو اس صورت میں اسے اپنا سب کچھ بیچنا پڑتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی فروخت کر دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو زمین اور گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے، اور دوسرے علاقے میں پناہ لیتا ہے، اس کی وجہ سے زمین ویران اور بنجر ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں بہت کم ایسا ہوا کہ کسانوں نے بغاوت کی ہو۔

ان کا رہن سہن سادہ ہوتا تھا، کچے مکان یا جھونپڑی میں رہتے تھے، پہننے کو سوائے ایک چادر کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا، اکثر کو گاؤں سے باہر جانے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا، ان کی تمام زندگی یکسانیت کے ساتھ گذر جاتی تھی۔ ان کی عورتیں ان کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی تھیں، مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں، اور گھر کا کام کاج بھی انہیں ہی کرنا پڑتا تھا۔

ان کی زندگی میں تفریح کے مواقع بہت کم تھے۔ تہواروں پر یہ کام سے فرصت پاتے تھے، ذات پات کا فرق بہت تھا، مذہبی تعصّبات میں جکڑے ہوئے تھے۔ چونکہ آبادی بہت تھی اور کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی اس لئے ہندوستان میں کوئی ایسی ایجادات نہیں ہوئیں کہ جو انسان کی محنت کی جگہ لے سکتیں۔

مغل کسان ہل چلاتے ہوئے

کاریگر

سماج کا ایک اہم طبقہ کاریگروں کا تھا، جو امراء اور عام لوگوں کی روزمرّہ کی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کام کرتے تھے، ان میں سنار، رنگریز، جولاہے، لوہار، معمار، پتھر توڑنے والے، اسلحہ بنانے والے، موچی، قالین بنانے والے، اور کاتب وغیرہ ہوتے تھے۔

گاؤں اور دیہات میں یہ کاریگر کسانوں اور گاؤں والوں کے لئے معمولی چیزیں بناتے تھے، جیسے لوہار نے کھیتی باڑی کے آلات کی مرمت کردی، یا جولاہے نے کپڑا بن دیا، موچی نے جوتے بنا دیئے، وغیرہ۔ مگر شہروں میں کہ جہاں امراء آباد تھے وہاں کاریگر اپنے ہنر اور فن میں ماہر ہوتے تھے اور ایسی اشیاء تیار کرتے تھے جو ان کے ذوق اور دولت کے مطابق ہوں۔

مغلیہ عہد کی جن شاندار عمارات کو ہم دیکھتے ہیں، ان کے استعمال کے برتن، اسلحہ، اور پہننے کے کپڑے اور زیورات کو دیکھتے ہیں تو اس سے ان کاریگروں کی فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر سماجی طور پر کاریگروں کا رتبہ گرا ہوا تھا، اپنی فنی صلاحیتوں کے باوجود ان کی مالی حالت خراب تھی، اور وہ مشکل سے گذارا کرتے تھے۔

ڈچ سیاح پیلسے ئرٹ کا کاریگروں کے بارے میں بیان

صبح سے شام تک کام کرنے کے بعد ان کی روزانہ کی کمائی مشکل سے اتنی ہوتی ہے کہ وہ گزارا کر سکیں۔ ایک دوسرا عذاب ان کے لئے گورنر، امراء، دیوان، کوتوال، بخشی اور دوسرے شاہی عہدے داروں کی شکل میں آتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی کو کام کروانے کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ کام کرنے والے کو، چاہے وہ نہ چاہے، زبردستی پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ ایک مزدور یا کاریگر کی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ وہ ذرا بھی اعتراض کرے۔ پورے دن کام کرنے کے بعد شام کو یا تو اسے معمولی اجرت دی جاتی ہے یا بغیر کسی ادائیگی کے اسے رخصت کر دیا جاتا ہے۔

اکبر کاریگروں کے کام کا معائنہ کرتے ہوئے

فوجی

بادشاہ یا امراء کی فوج میں جو لوگ عام فوجی کے طور پر ملازم ہوتے تھے، انہیں کبھی بھی وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ کبھی کبھی یہ سال ڈیڑھ سال کے بعد ادا کی جاتی تھی۔ اگر فوجی مہمات ہوتی تھیں تو لوٹ مار کے مال کے ذریعہ یہ اپنا نقصان پورا کرتے تھے۔ زخمی ہونے کی صورت میں علاج معالجہ کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ بوڑھے ہونے پر پنشن دینے کا رواج بھی نہیں تھا۔ عام فوجیوں کی اس حالت زار کو فرانسیسی سیاح برنیر نے بھی دیکھا اور لکھا کہ جب فوجیوں کو تنخواہیں نہیں ملتی ہیں تو اس کے خراب نتائج ہوتے ہیں:

"سپاہی اپنا معمولی سامان جوان کے پاس ہوتا ہے اسے بیچ کر گذارا کرتے ہیں۔"

فوجی

ملازم

ایک ایسے سماج میں کہ جہاں امیر اور غریب کا فرق بہت زیادہ ہو، وہاں بے روزگاروں کی بڑی تعداد معمولی ملازمت کے لئے تیار رہتی ہے۔ چنانچہ مغل سماج میں بادشاہ اور امراء کی خدمت کے لئے بے شمار ملازم ہوا کرتے تھے۔ اگر چہ ان لوگوں کو تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں، مگر وہ امیر کا ملازم ہونے کے ناطے رشوت، غبن، اور بدعنوانی کے ذریعہ کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا تھا۔ چونکہ ان کو بہت کم اجرت ملا کرتی تھی، اس لئے ان کا ایماندار ہونا مشکل تھا۔

ایک امیر کے لئے یہ شان کی بات تھی کہ اس کے پاس زیادہ سے زیادہ ملازم اور خدمت گار ہوں جب وہ اپنی حویلی

یا محل سے باہر جاتا تھا تو اس کے ملازمین اس کے گھوڑے یا پالکی کے ساتھ ساتھ بھاگتے تھے۔ ایک امیر کے ضروری ملازموں میں سائیس، گاڑی بان، فراش، مشعل چی، ساربان، مہاوت، مورچھل بردار، اور پیغام بردار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ گھریلو ملازم ہوتے تھے جن میں باورچی، دھوبی، نائی اور اس کی ذاتی خدمت کرنے والے ہوتے تھے۔ محل کے زنانے حصہ میں ملازم عورتیں ہوتی تھیں۔

مغل شہر اور غریب آبادیاں

اگرچہ مغلوں نے بڑے بڑے شہر بنائے، مگر ان شہروں میں امیر و غریب کی آبادیوں میں فرق تھا۔ ان دونوں کے محلّے علیحدہ علیحدہ ہوا کرتے تھے۔ اگر ایک جانب امراء کی حویلیاں، اور باغات تھے تو دوسری جانب غریبوں کی آبادیاں کچے مکانوں یا جھونپڑیوں پر مشتمل ہوتی تھیں، مکان برابر ہوتے تھے، اس لئے ان کے محلوں کی آبادی گنجان ہوا کرتی تھی۔ سڑکوں اور پانی کے نکاسی کے نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے بارش میں یہاں پانی جمع ہو جاتا تھا، جس سے مختلف وبائیں پھوٹ پڑتی تھیں، بیماریوں کے علاج کے لئے کوئی سہولتیں نہیں تھیں، اس لئے اکثریت ان بیماریوں کا علاج جھاڑ پھونک سے کرواتے تھے۔

عام آدمی اپنے رہنے کے لئے کچی مٹی کے مکان بناتا تھا۔ جس کی چھت چھپر کی ہوتی تھی۔ مکان میں عام طور سے ایک کمرہ ہوا کرتا تھا۔ کمرے میں کھڑکی یا روشن دان رکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس میں ہوا صرف دروازے سے آتی تھی۔ فرش اور دیواروں پر گوبر کا پلاسٹر ہوا کرتا تھا۔

گھر میں کوئی فرنیچر نہیں ہوتا تھا، سوائے دو چار پلنگوں کے۔ غریب لوگ دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے۔ تہواروں اور خاص موقعوں پر دہی، سستی مٹھائیاں، اور گڑ مل جاتا تو ان کے لئے یہ نعمت تھا۔

عام آدمی کا لباس بھی ایک چادر ہوتی تھی، جسے وہ دھوتی یا لنگی بنا کر جسم سے لپیٹ لیتا تھا، غریب لوگ جوتے نہیں پہنتے تھے، اور ننگے پیر چلا کرتے تھے، اگر بہت ضروری ہوا تو چپل کا استعمال کرتے تھے۔

عورت

عورت کا سماجی درجہ گرا ہوا تھا۔ امراء کی عورتیں بھی پردہ اور دوسری پابندیوں کا شکار تھیں، ان کے لئے ایسے مواقع بہت کم تھے کہ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کو استعمال کر سکیں۔ ان کے مقابلہ میں غریب عورتیں سخت محنت و مشقت کی زندگی گذارتی تھیں۔ کسان عورتیں کھیتوں میں کام کرتی تھیں، مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں، اور گھریلو کام میں مصروف رہتی تھیں، اس لئے نہ وہ پردہ کر سکتی تھیں، اور نہ اچھا لباس اور زیورات کا استعمال کر سکتی تھیں۔

امراء کے گھروں میں بھی بڑی تعداد میں عورتیں ملازم ہوتی تھیں۔ ان میں سے کئی کی نسلیں ایک ہی خاندان کی ملازمت کرتے گذر جاتی تھیں۔

ہندوؤں میں ابھی تک عورتوں کو ستی کرنے کا رواج تھا۔ اگرچہ اکبر نے اس پر پابندی لگادی تھی اور عہدے دار سختی سے اس کو روکتے تھے۔

ابھی تک بیوہ عورت دوسری شادی نہیں کرتی تھی، اسے برا سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کا اثر مسلمانوں پر بھی ہوا، اوران کے ہاں بھی بیوہ کی شادی کا رواج نہیں رہا۔ بچپن کی شادی کا رواج بھی باقی رہا۔ اس لئے وقت کے آگے بڑھنے کے باوجود سماجی طور پر عورت کا رتبہ گرا ہوا ہی رہا۔

ستی کی رسم کے بارے میں برنیر کا بیان

حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ ہندوؤں کے رسم و رواج میں دخل نہ دیں اور انہیں مذہبی رسومات بجالانے میں پوری آزادی دی جائے۔ لیکن وہ ستی کی رسم کو مختلف طریقوں سے روکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کوئی عورت اپنے صوبہ کے گورنر کی اجازت کے بغیر ستی نہیں ہوسکتی ہے۔ جب ایسا موقع آتا ہے تو گورنر بیوہ کو سمجھاتا ہے، اگر پھر بھی وہ باز نہ آئے اپنی بیگمات کے پاس بھیج دیتا ہے کہ وہ اسے سمجھائیں، لیکن پھر بھی وہ عورت بضدر ہے تو اس کو اجازت دینی پڑتی ہے۔

مغل زوال

کہا جاتا ہے کہ ہر وہ چیز کہ جو بلندی کو چھولیتی ہے، اور کمال کی حد تک پہنچ جاتی ہے، بالآخر وہ زوال پذیر ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ ہندوستان میں مغل امپائر بھی اٹھارہویں صدی کے شروع میں اپنی بلندیوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی شان و شوکت سے دنیا مرعوب تھی۔ اس کی دولت کے قصے سارے عالم میں پھیل چکے تھے جس کی وجہ سے دوسرے ملکوں سے لوگ دولت کی خاطر یہاں آرہے تھے۔ ہندوستان میں تمام بڑی سیاسی طاقتیں شکست کھا چکی تھیں۔ مغل بادشاہ کی عزت ہر ہندوستانی کے دل میں تھی۔ مغل دربار ادیبوں، شاعروں، مورخوں، موسیقاروں، رقاصوں، خوشنویوں، علماء اور ہنر مند کاریگروں کی سرپرستی کررہا تھا۔

تاریخ میں ایک اصول یہ رہا ہے کہ جب کوئی امپائر بہت زیادہ پھیل جاتی ہے، تو یہ پھیلاؤ اس کو کمزور کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کیونکہ اتنی بڑی امپائر کے انتظام کے لئے ایک بڑی تعداد تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی کمی کے باعث دور دراز کے علاقے مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی کچھ مغلیہ امپائر کے ساتھ ہوا۔

ابتداء میں مرکزی طاقت بہت مضبوط تھی۔ مگر جب مرکزی طاقت میں کمزوری آنا شروع ہوئی تو امپائر ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگئی۔ اس وجہ سے کچھ مورخ یہ کہتے ہیں کہ دراصل یہ زوال نہیں تھا، بلکہ مرکزی طاقت کا ٹوٹنا تھا جس نے سیاسی استحکام کو ختم کیا۔

مغل زوال کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ حقیقت میں یہ مغل شاہی خاندان کا زوال تھا، ہندوستان کے سماج کا نہیں، وہ معاشی اور سماجی طور پر پوری طرح سے تروتازہ تھا۔ جس وقت دہلی میں معاشی مسائل تھے، اس وقت اس کے دور دراز کے علاقے جیسے مہاراشٹر وغیرہ تجارتی طور پر ترقی کر رہے تھے اور سورت کی بندرگاہ بیرونی تجارت کا بڑا مرکز تھی۔

بہرحال مغل زوال کے بارے میں مورخوں کی کئی رائیں ہیں۔ مثلاً ابتدائی مورخوں نے مغل زوال کی جن وجوہات کی طرف اشارہ کیا ہے، ان میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کہ جس نے ہندوؤں اور خاص طور سے راجپوتوں کو ناراض کر دیا۔ اورنگ زیب کے بعد تخت کے حصول کے لئے جو خانہ جنگیں ہوئیں انہوں نے نہ صرف مغل فوجی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بلکہ ان جنگوں کی وجہ سے آئے دن قتل و غارت گری ہوئی، امراء کی وفاداریاں بدلیں۔ دربار کی سازشوں، امراء کی نالائقیوں نے انتظام سلطنت کو بگاڑ دیا۔ جب مرکز کمزور ہوا اور صوبائی حکومتیں خودمختار ہوگئیں تو انہوں نے مرکز کو ٹیکس دینا بند کر دیا، جس کی وجہ سے دربار کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ جب مرکز کمزور ہوا تو جاٹوں، سکھوں، مرہٹوں، اور روہیلوں نے بغاوتیں کرنی شروع کر دیں۔ ان سب باتوں نے مل کر مغل زوال کو تیز تر کر دیا۔

ایک اور رائے میں مغل زوال کا اصل سبب یہ بتایا ہے کہ جب اورنگ زیب اور اس کے بعد آنے والے بادشاہوں نے نئے منصب داروں کو جاگیریں دینا شروع کیں تو آہستہ آہستہ جاگیریں ختم ہوتی گئیں، یہاں تک کہ وہ جاگیر جو ''خالصہ'' کہلاتی تھی اور جس کی آمدنی بادشاہ کو ملتی تھی، وہ بھی نئے امراء کو دیدی گئیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ بادشاہ کی آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اور وہ کبھی مرہٹوں کا وظیفہ خوار ہوا تو کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا۔ اس کو مورخ ''جاگیرداری کا بحران'' کہتے ہیں۔

جاگیرداری کے بحران سے ملا ہوا ہے ایک سبب یہ بھی ہے کہ چونکہ منصب داروں کی جاگیریں بدلتی رہتی تھیں، اس

لئے انہیں زراعت کی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ کسانوں کا استحصال کر کے زیادہ سے زیادہ لگان یا ریونیو جمع کرنا چاہتے تھے۔ اس نے بالآخر کسانوں کو بالکل مفلس بنا دیا، اور وہ زمینیں چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے۔

ایک اور نقطۂ نظر یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں بنکرز، سیٹھوں، اور ساہوکاروں کا طبقہ طاقت ور بن کر ابھرا، انہوں نے اپنی بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں قائم کیں۔ یہ صوبائی حکومتوں کے لئے کام کرتے تھے، ان کے لئے ریونیو جمع کرتے تھے، انہیں سود پر روپیہ قرض دیا کرتے تھے، ان کے یورپی تاجروں سے بھی اچھے تعلقات تھے کیونکہ یہ ان کے لئے ہندوستان سے تجارت کا مال جمع کر کے انہیں دیتے تھے اور اپنا مال ان کے جہازوں میں بیرونی ملکوں میں بھیجتے تھے۔ ان تجارتی مفادات کی وجہ سے ان تاجروں کا تعلق مغل حکومت سے کم اور یورپی تاجروں سے زیادہ ہو گیا۔

مغل زوال کو خاص طور سے برطانوی مورخوں نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ کیونکہ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مغل زوال کی وجہ سے ہندوستان میں جو افراتفری تھی، انتشار تھا، اور سیاسی بے چینی تھی، ان کی حکومت نے اسے ختم کر کے ہندوستان کو امن وامان اور خوش حالی دی۔

اشاریہ